یا رب

غلام میراں

عدم ادراک سے ادرک تک کی داستان۔ ایک مجرم کی روداد جسے اس کے احساس ندامت نے مجرم نہ رہنے دیا۔کسی برگزیدہ ہستی کی نظرکا کرشمہ۔ایک بے وفا کی بے وفائی کا فسانہ۔
کسی کی بے لوث چاہت کی کہانی۔
ایک عظیم ذی روح کی عظمت کا احوال جوموت کی اذیت بھلا کر اخبار کے گردآلو ٹکڑے پر معاف لکھتا رہا۔
ایک بلند حوصلہ باپ کی بپتا جو اپنے بیٹے کی وصیت پر پابند رہا۔
سلاخوں کے پیچھے مقید قیدیوں کے لیے امید کی ایک کرن۔
آشقہ دلوں کے لیے بطور خاص آنسوؤں کی روشنائی سے لکھا جانے والا ناول۔

یارب

غلام میراں

عدم ادراک سے ادرک تک کی داستان۔ ایک مجرم کی روداد جسے اس کے احساس ندامت نے مجرم نہ رہنے دیا۔کسی برگزیدہ ہستی کی نظر کا کرشمہ۔ایک بے وفا کی بے وفائی کا فسانہ۔

کسی کی بے لوث چاہت کی کہانی۔

ایک عظیم ذی روح کی عظمت کا احوال جوموت کی اذیت بھلا کر اخبار کے گرد آلو ٹکڑے پر معاف لکھتا رہا۔

ایک بلند حوصلہ باپ کی بپتا جو اپنے بیٹے کی وصیت پر پابند رہا۔

سلاخوں کے پیچھے مقید قیدیوں کے لیے امید کی ایک کرن۔

آشفتہ دلوں کے لیے بطور خاص آنسوؤں کی روشنائی سے لکھا جانے والا ناول۔

''چاچو طہٰ کے کمرے میں کتابوں والی الماری'' ایک چھوٹے سے رقعے پر درج عبارت پڑھتے ہی اس کا سرتاسف سے دائیں بائیں ہلنے لگا۔

وہ مجھ سے (طہٰ عالم) سے فقط ایک بار ملی تھی اور اس پر لی ہی ملاقات کے بعد وہ میرے متعلق کیسا سوچتی ہوگی اس بات کا مجھے علم تھا' اس کے ہاتھ میں موجود رقعہ ایک کھیل کا حصہ تھا۔ جو میرے بھتیجے رومی میاں کا ایجاد کردہ تھا۔

ایک غیر ملکی چینل اے ایکس این پر چلنے والے اپنے پسندیدہ کھیل ''منٹ ٹو ون اٹ'' کو رومی میاں نے اپنے انداز میں ''فائنڈ ٹو ون اٹ'' میں کچھ یوں ڈھالا تھا کہ پھر گھر کے مختلف حصوں میں چند رقعے چھپا رکھے تھے' کسی بھی ایک دفعہ کے مل جانے پر اس پر اگلے رقعے تک پہنچنے کے لیے اشارہ عبارتاً درج تھا۔کم سے کم وقت میں سبھی رقعے کھوج لانے والا۔ اس کھیل کا فاتح ٹھہرتا لیکن وہ تا حال رقعہ ہاتھ میں تھامے جیسے تذبذب کا شکار کھڑی تھی اور میرے کمرے میں آنے سے کترا رہی تھی۔ جب وہ ایک دم سے چونکی۔اس کی ٹیم کے ننھے منے کھلاڑی اسے بلند آواز میں پکار رہے تھے...... ''گو گو...... یومنہ آنٹی'' بچوں کو یوں پکارتا دیکھ کر لامحالہ اسے میرے کمرے تک آنا ہی پڑا۔ دروازے تک پہنچنے کے بعد اس نے کچھ سوچتے ہوئے جوتے باہر ہی اتار دیئے تھے اور ساتھ ہی دھیرے سے دروازہ کھول کر وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔اندر پہنچتے ہی اس نے ایک طائرانہ سی نگاہ دوڑا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ اب اسے اطمینان ہو چکا تھا کہ میں اپنے کمرے میں نہیں ہوں اور اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ایسی ہی دعائیں مانگ رہی تھی۔

کمرے میں کوئی کسی قسم کا برقی قمقمہ روشن نہ تھا۔ فقط مغربی سمت میں کھلنے والی کھڑکی سے سہ پہر کے اس حصے میں سورج کی کرنیں جیسے زینہ بنا کر اتر رہی تھیں۔یوں وہ کمرے میں پھیلی اس ملگجی روشنی میں سر کو دروازے کی جانب گھما کر دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے چلتے میرے پلنگ کے ساتھ پڑی

الماری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یکا یک جو میں نے ایک طویل سجدے سے اپنے سر کو اٹھایا تو وہ مجھ سے ٹکرا کر بامشکل گرتے گرتے سنبھلی اور بھونچکا سی ہو کر اپنے حلق سے نکلتی چیخ پر اس نے مشکل سے قابو پایا تھا' تو دوسری جانب مجھے بھی اس کا بنا دستک دیئے میرے کمرے میں چلے آنا معیوب لگ رہا تھا۔ میں متعجب سا اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تو اب سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ سراسیمہ سی ہو کر میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اشارتاً مجھ سے معذرت چاہی اور میں نے بھی اشارتاً ہی اس کی معذرت کو قبول کر لیا تھا۔ ساتھ ہی مجھے یاد آنے لگا کہ چند لمحے پہلے رومی میاں بھی ایسے ہی انداز سے کمرے میں آئے تھے اور الماری میں کچھ چھوڑ کر الٹے پیروں لوٹ گئے تھے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے انگشت شہادت سے اس کی عقبی جانب اشارہ کیا' تو وہ میرا اشارہ پا کر وہ پلٹی' اس نے الماری میں پڑا رقعہ اٹھایا اور کاندھے سے کمر کی طرف گرہ لگے آنچل کو کھول کر سر پر اوڑھتے ہوئے جیسے داخل ہوئی تھی ویسے ہی دھیرے سے کمرے سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بابا رب نواز کی دی کالی چادر کو ایک بار پھر سے کھول کر اپنے کاندھوں کے گرد اوڑھا اور جائے نماز پر بیٹھتے ہی تسبیح ہاتھ میں لے کر آنکھیں موند لیں۔

اگلے روز فجر کی نماز سے فراغت پاتے ہی میں حسب معمول تسبیح ہاتھ میں لیے چھت پر آ گیا تھا۔ چھت پر آنے کی خاص وجہ یہ بھی کہ صبح تڑکے چھت کا رخ کوئی بھی نہ کرتا تھا یوں مجھے تنہائی میسر آ جاتی تھی اور میں وہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلتا ہوا چند وظائف پڑھ لیا کرتا تھا۔ آج یونہی ٹہلتے ہوئے یکا یک میری نظر کسی کے سر پر پڑی کوئی نیچے لان میں جاگنگ کر رہا تھا لیکن گھر میں کوئی بھی ایسا فرد نہ تھا جو یوں طلوع صبح اٹھ کر جاگنگ کرتا ہو تو پھر وہ کون تھی؟ سرعت سے میرے ذہن میں خیال آیا' میں یہ جاننے کے لیے متجسس انداز میں ذرا سا آگے کو جھکا یہاں چھت کہ اس حصے سے لان کا کچھ حصہ ہی دکھائی دیتا تھا لیکن مجھے وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔ میں وہاں سے ہٹنے کو ہی تھا جب وہ مجھے ٹریک سوٹ پہنے کانوں میں ہینڈ فری لگائے جاگنگ کرتی دکھائی دی اور میں اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر میں پہلا ساطہ عالم ہوتا تو یوں اسے جاگنگ کرتا دیکھ کر جھٹ سے اپنے کمرے میں پہنچ کر ٹریک سوٹ پہنتا اور لان میں پہنچ کر اسے خوب تنگ کرتا کہ وہ چڑ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

یومنہ میرے چچا مرزا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھی اور اس کی والدہ یعنی میری چچی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ان کا تعلق ایک بڑے زمیندار گھرانے سے تھا۔ جب ان کے والدین رضائے الٰہی سے وفات پا گئے تو زمینوں کی دیکھ بھال کی خاطر چچا کو اپنے خاندان بھر کے ساتھ گاؤں جانا پڑا' تبھی سے وہ وہیں مقیم ہو کر رہ گئے تھے اور جب یومنہ کی بڑی بہن آمنہ کے رشتے کی بات مجھ سے بڑے بھائی غلام مصطفیٰ عالم کے لیے چلی تو ماں نے اس رشتے کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا پھر اس بات کو لے کر جو میرے چچا چچی خفا ہوئے تو اس بات کو بیتے بھی اب عرصہ ہو چکا تھا۔ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رنجش رفو ہو گئی تھی یا پھر کوئی مجبوری تھی جو انہیں یومنہ کو ہمارے ہاں بھیجنا پڑا تھا۔ وہ ماسٹر کر رہی تھی' اور چند روز ہی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں بیتانے کے بعد وہ مستقل طور پر ہمارے گھر رہنے آ گئی تھی۔ پھر یہ بات مجھے

بعد میں معلوم پڑی تھی کہ درحقیقت بڑے ابا اسے ہاسٹل سے گھر لے آئے تھے اور میں یہ جاننے کے بعد سوچنے لگا کہ بزرگوں کی چھایا بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے' آج جو میں جیتا جاگتا اپنے پیروں پر چلنے پھرنے کے قابل ہو پایا تھا تو اس میں بھی بڑے ابا کا بڑا کردار شامل تھا۔ میرے لبوں پر صدا ان کے لیے دعائیں جاری رہتی تھیں' وہ مجھے اپنے ابا سے بھی بڑھ کر عزیز تھے اور جب بھی وہ بہت بیمار پڑ جاتے اور مجھے پاس بلا کر کہتے کہ ''طٰہٰ میاں اب ہمارے جانے کا وقت آ گیا ہے'' تو ان کی یہ بات سن کر میری آنکھیں یوں برس پڑتیں کہ ان کے ہاتھ بھیگ جاتے اور وہ مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہنے لگتے کہ ''میاں تمہاری یہ محبت ہی ہمیں اس دنیا میں روکے ہوئے ہے'' اور میں بچوں کی طرح چلانے لگتا کہ بڑے ابا میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں اپنے بازو پھیلا کر انہیں یوں جکڑ لیتا کہ پاس موجود لوگوں کی آنکھیں بھی رقت جذبات سے بھیگنے لگتیں اور وہ بھی بڑے ابا سے میری محبت اور وابستگی کو دیکھ کر میری طرح ان کی لمبی عمر کے لیے دعائیں کرنے لگتے۔ مجھے یونہی خیالوں میں گم چھت پر ٹہلتے ہوئے آج کچھ زیادہ ہی وقت بیت گیا تھا۔ جب بابا عبدالقادر مجھے ڈھونڈتے چھت پر آ پہنچے تھے۔

''صاحب ناشتے کی میز پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔'' وہ میرے پاس آ کر ہاتھ باندھے جب یوں مجھ سے مخاطب ہوتے تو مجھے ان پر بڑا پیار آتا تھا۔ انہیں میں یونہی ادب سے ہاتھ باندھے محبت سے بات کرتے دیکھتا تو سوچتا رب سوہنے نے ہم پر جو پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے تو اس میں بھی ہمارا ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے ہونا رب سوہنے کو کیسا پیارا لگتا ہوگا۔ اسے بھی ہم پر کس قدر پیار آتا ہوگا' ذات' پات' رنگ' نسل' امیری' غریبی' سندھی' پنجابی' بلوچی' پٹھان کسی بھی تفریق کے بغیر رب سوہنا سبھی کو اپنی رحمت کی چھایا میں لے لیتا ہوگا۔ جیسے آگے بڑھ کر میں نے اپنا ایک بازو بابا عبدالقادر کے کاندھوں کے گرد حائل کر دیا تھا اور اب میں ان کے ہمراہ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔

ہمارے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی بابا عبدالقادر رسوئی میں جا گھسے اور میں ہولے سے سلام کرنے کے بعد بڑے ابا کے ہاتھ پر بوسہ دے کر ان کی بغل مین ہی خاموشی سے بیٹھ گیا تھا۔ پہلے شاید وہاں کچھ باتیں ہو رہی ہوں لیکن اب میرے وہاں پہنچنے پر مکمل طور پر خاموشی چھا چکی تھی۔ فقط رسوئی سے پانی کے گرنے اور برتنوں کے ٹکرانے کا شور سنائی دے رہا تھا' لیکن چند لمحے بعد ہی اس شور میں انسانی آوازوں کا اضافہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

جب یومنہ ہاتھوں میں چند کاغذات تھامے ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی تو سبھی کو سلام کرنے کے بعد وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ آج وہ پہلے روز ہمارے ساتھ ناشتے کی میز پر آئی تھی' وہ بچپن میں بھی ایک دو بار ہی ہماری طرف آئی ہوگی' اسی وجہ سے اب اس کے عرصہ دراز کے بعد ہمارے ہاں آنے پر ماں چند روز تک ناشتہ اور کھانا اس کے کمرے میں ہی بھجوا دیتی تھی' تاکہ چند روز میں وہ بھی سے جان پہچان بنا لے تو اسی بیچ اس کی جھجک بھی مٹ جائے گی۔ یوں آج وہ بھی کے ساتھ ناشتے کی میز پر موجود تھی۔ اس کے آ جانے کے بعد میری نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ جب مجھے ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ یومنہ سے مخاطب تھی۔

''بیٹا اگر آپ پڑھنا چاہتی ہو تو ناشتا آپ کے کمرے میں ہی بھجوا دیں''۔

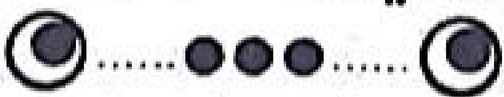
''ارے نہیں آنٹی دراصل آج کلاس میں پریذنٹیشن ہے' میں نے سوچا جب تک ناشتہ مکمل ہوگا چند پوائنٹس ذہن نشین ہو جائیں گے۔'' ماں کی بات سن کر اس نے سرعت سے جواب دیا تو بڑے ابا اس کی بات مکمل ہوتے ہی سراہتے ہوئے بولے۔

''بھئی ہماری بیٹی تو بڑی ہونہار ہے۔'' یومنہ بڑے ابا کی بات سن کر شرماتے ہوئے مسکانے لگی اور میں بدستور ابھی تک چپ چاپ ہی بیٹھا تھا۔ جب ابا اس سے دریافت کر رہے تھے۔

''بیٹا آپ کی پریذنٹیشن کا موضوع کیا ہے؟''

''جی انکل میرا موضوع ایک نیا دریافت ہونے والا ذرہ ہگ بوسون ہے' جس کا نام دو سائنس دانوں ہگ اور بوسون کے ناموں کی نسبت سے ہی رکھا گیا ہے۔ یہ ہگ اور بوسون کی حالیہ دریافت ہیں جس پر انہیں نوبل پرائز سے بھی نوازا گیا ہے۔'' ابا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے یومنہ ہاتھ میں پکڑے صفحات کو بھی الٹا پلٹا کر دیکھتی رہی' ابا اس کے موضوع سے متعلق جان کر اسے سراہے بنا نہ رہ سکے تو ماں یوں خاموش رہی جیسے ان کے پلے کوئی بات ہی نہ پڑی ہو وہ فقط ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک جو انہوں نے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی تو جیسے اب ان کے چہرے سے مسکان غائب ہو چکی تھی اور میں نے بھی جو ایک لمحہ بھر کو نگاہیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا تھا تو فوراً ہی اپنی نگاہیں واپس جھکا لی تھیں۔ میں نے اس وقت بھی بابا رب نواز کی کالی چادر کو اوڑھ رکھا تھا اور سر کو قدرے خم دیئے سبھی کی باتیں سن رہا تھا کہ یکا یک یومنہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''طہٰ سنا ہے آپ یونیورسٹی کے دنوں میں بڑے اچھے مقرر رہ چکے ہیں۔ آپ میری پریذنٹیشن میں کچھ ہیلپ کریں ناں۔'' وہ اپنی بات کہہ چکی تھی اور جواب طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی لیکن اس کی بات ختم ہونے تک میری کیفیت ہی بدل چکی تھی۔ مجھ پر رعشہ سا طاری ہو چکا تھا۔ میں اپنی سیمابی کیفیت پر قابو پانے کی کشمکش میں مبتلا تھا' میرا وجود مجھے سرد ہوتا محسوس ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی اپنی ہتھیلیوں اور پیشانی پر پسینے کی موجودگی کو بھی میں محسوس کر سکتا تھا پھر ایک جھماکا سا ہوا اور میرے چار سو منظر بدلنے لگا۔ چار سو چلتی خوفناک آندھی......اسپیکروں سے نکلتی پھٹی پھٹی آوازیں ...... انسانوں کے انبوہ سے بلند ہوتا نعروں کا شور......اور تاریک آندھی میں اڑتے اخبارات کے صفحات اب مجھے واضح دکھائی دے رہے تھے' پھر یکا یک ہوا میں اڑتے ان صفحات میں سے ایک خون آلود صفحہ میرے چہرے سے آ چپکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں حواس باختہ ہو کر اپنے ہاتھ اٹھائے چہرے سے چپکے خون آلود اخبار کو ہٹانے کی کوشش میں چیخنے لگتا' میرے قریب بیٹھے بڑے ابا میری دگرگوں ہوتی کیفیت کو بھانپ چکے تھے۔ وہ چند لمحوں تک میری طبیعت کے سنبھلنے کا انتظار کرتے رہے لیکن انہوں نے جب مجھے ہر طرح سے بے بس پایا تو مجھے کاندھوں سے تھامے اٹھایا اور میں ان کے ہمراہ منوں بھاری ہوتے وجود کے ساتھ رینگتا ہوا چلنے لگا۔ ماں اور ابا آزردگی سے سر کو جھکائے وہیں بیٹھے رہے۔ جبکہ یومنہ کی متعجب نگاہیں سوال بنی دیر تک میرا تعاقب کرتی رہیں۔



بڑے ابا مجھے لے کر ڈائننگ ہال سے میرے کمرے میں آئے تھے' لیکن تاحال میں سیمابی کیفیت میں مبتلا گم صم سا تھا اور بڑے ابا بھی فقط

اشاروں کنایوں میں ہی اپنی بات سمجھاتے رہے تھے۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ میرے ذہن میں چلتی اتھل پتھل اگر رک سکتی تھی تو ایک ہی صورت میں کہ مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ اسی مقصد سے وہ مجھے آرام کرسی پر بیٹھا کر وہاں سے جا چکے تھے۔ ان کے کمرے سے نکلتے ہی میرے ذہن کے سلولائیڈ پر پھر سے ڈائننگ ہال کا منظر چلنے لگا تھا۔ یکا یک جو یومنہ نے مجھے مخاطب کیا تو گویا میری روح تک کو ہی جھنجوڑ ڈالا تھا۔

اس سے پہلے کہ ایک بار پھر سے میں ویسی ہی کیفیت کا شکار ہونے لگتا' میں سبھی قسم کے خیالات کو جھٹک کر سوچنے لگا کہ میں اس کی پریذنٹیشن میں کیا مدد کرسکتا ہوں' اس کے بقول کہ آج ہی اس کی پریذنٹیشن ہے اور اس نے جو موضوع بتایا تھا وہ کسی نئے دریافت ہونے والے ذرے کی بات کررہی تھی جس کا نام دو سائنسدانوں ہگ اور بوسون کے ناموں کی نسبت سے ہی رکھا گیا تھا یعنی کہ اس کا موضوع ہگ بوسون ایک نیا دریافت ہونے والا ذرہ تھا۔ یہ نئی دریافت اور اس کے سائنس دان دونوں ہی میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ معلومات ہی سہی یہ سوچ کر میں نے اپنا کمپیوٹر آن کیا اور سرچ انجن میں ہگ بوسون لکھ کر جوانٹر کا بٹن دبایا تو سرعت سے اس موضوع سے متعلقہ بہت سے صفحات میرے سامنے کھل چکے تھے۔ پھر ایک ایک کر کے میں ان صفحات کا مطالعہ کرنے لگا تھا۔

دنیائے سائنس کس قدر ترقی یافتہ ہو چکی تھی اور پھر اسی ترقی یافتہ دنیا کے دو بڑے سائنس دان ہگ اور بوسون خود دنیا کو بتا رہے تھے کہ ''یس'' ''آئی ایم دابلیور'' وہ اس نئے دریافت ہونے والے ذرے کے لیے منعقد ہونے والی اس عظیم و عالیشان تقریب میں جہاں دنیا جہاں سے آئے سینکڑوں اعلیٰ دماغ موجود تھے۔ جن میں ہر مذہب رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے افراد جمع تھے۔ وہ انہی کے سامنے بے ساختہ اپنے ہاتھ اٹھائے خوشی سے سرشار ہو کر بتا رہے تھے کہ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ خدا ہے' کوئی ہے' جس کے دم سے اس کائنات کا نظام چل رہا ہے' کسی اعلیٰ وارفع واحد و یکتا ہستی کا وجود ہے جو کائنات کے ذرے ذرے سے ظاہر ہو رہا ہے۔ مجھے یومنہ کا چنا یہ موضوع بے حد پسند آیا' جوں جوں میں مطالعہ کرتا چلا گیا۔ مجھے اس نئی دریافت سے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوتی چلی گئیں پھر ایک دم سے مجھے دہریہ قسم کے لوگوں کا خیال آنے لگا جو سرے سے ہی خدا تعالیٰ کے وجود سے منکر ہیں' میں اپنی اب تک کی زندگی میں کسی ایسے شخص سے نہ ملا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا کہ اگر زندگی نے وفا کی اور کبھی ایسا کوئی شخص زندگی میں ملا تو اسے یہ ضرور کہوں گا کہ تم جیسے لوگ جو خدا تعالیٰ کے وجود کو نہیں مانتے' اس کے بھیجے نبیوں کو بھلا کیسے مانو گے' ان پر نازل کردہ مصحف کا بھلا کیونکر مطالعہ کرو گے لیکن آج سائنس بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے جس حقیقت سے تم لوگ نظریں چرا رہے ہو۔ یہ تمہی لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

ایسے ہی خیالوں کے دائرے سے میں اس وقت پلٹا جب دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ میں نے آواز دی تو یہ بابا عبدالقادر تھے۔ وہ دوا والی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئے۔

''صاحب دوا لے لیجیے۔'' انہوں نے ٹرے کو میز پر رکھتے ہوئے نہایت شائستگی سے کہا۔ میں دوا کھا لوں گا میں نے فقط انہیں اشارتاً ہی جواب دیا۔ جسے سمجھ لینے کے باوجود وہ وہی کھڑے رہے پھر

میرے مزید کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ بولے۔

”بڑے صاحب کا پیغام ہے میں آپ کو دوا کھلا کر ہی کمرے سے باہر آؤں۔“ اور میں ان کی بات سنتے ہی سوچنے لگا کہ ایک بڑے ابا کے سوا اور بھی تو گھر میں اتنے سارے لوگ موجود ہیں۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جب بابا عبدالقادر نے پانی بھرا گلاس میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے دوا کھالی تو وہ دوا والی ٹرے اٹھا کر پھر کمرے سے چلے گئے تھے۔

دوپہر کھانے کے بعد میں ذرا استراحت کو لیٹ گیا تھا اور جو عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں کمرے سے باہر آیا تھا تو میرا مقصد فقط بڑے ابا کے کمرے میں جا کر ان کا حال دریافت کرنا تھا۔ اب اس عمر میں وہ غذا سے زیادہ دوا سے ہی چل رہے تھے۔ پھر میں ان کے کمرے تک پہنچنے ہی والا تھا جب یکا یک مجھے اپنے ہاتھ کے ساتھ کسی ننھے سے ہاتھ کے چھونے کا احساس ہوا' اور جو میں نے سر گھما کر دیکھا تو یہ رومی میاں تھے۔ میں نے ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا تو مجھے ان سے معلوم پڑا کہ وہ میرے لیے کسی کا پیغام لائے تھے اور وہ یومنہ تھی۔ جو اس وقت لان میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔

رومی میاں کے کاندھے پر ہلکی سی تھپکی لگا کر میں نے کہا کہ انہیں بولنا وہ تھوڑی دیر میں آ رہے ہیں اور میں بڑے ابا کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ ان کے کمرے میں پہنچ کر مجھے معلوم پڑا کہ وہ اپنے کمرے میں ہی نہ تھے اور یوں اب میں لان کی جانب بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ عمر کے اس حصے میں بھی آرام سے کہاں بیٹھنے والے تھے۔ لازماً کسی کا کوئی مسئلہ سلجھانے گئے ہوں گے یا کسی کی مالی اعانت کو پہنچے ہوں گے۔ ان میں اور میرے ابا میں یہی ایک بڑا فرق تھا۔ میرے ابا ٹھہرے آج کی دنیا کے مادہ پرست انسان' آج وہ جس بھی مقام پر تھے وہ سارا مقام و مرتبہ بڑے ابا کی بدولت ہی تو تھا۔ انہوں نے جو اپنی زندگی کے کئی برس بنا کسی لالچ و طمع کے انسانیت کی بھلائی میں صرف کیے تھے۔ میرے ابا آج ان برسوں کا حساب دولت سمیٹ کر چکا رہے تھے۔ کبھی میں بھی ابا کے ساتھ ان کی دولت سمیت سیاست کا ایک اہم حصہ تھا لیکن آج مجھے ایک ایم این اے کا بیٹا ہونے پر کوئی فخر محسوس نہ ہوتا تھا۔ آج اگر گھر میں میری کوئی پسندیدہ شخصیت تھے تو وہ بڑے ابا ہی تھے۔ یونہی سوچتے ہوئے میں لان میں لگی کرسیوں تک پہنچ چکا تھا۔ یومنہ مجھے دور سے ہی اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تو پاس پہنچ کر میں نے سلام میں پہل کی اور اسے کھڑا دیکھ کر خود بھی بیٹھتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

پھر ایک نظر میں ہی اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے اس روز ڈائننگ ہال میں مجھ پر طاری ہو جانے والی عجیب کیفیت کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ایسے بہت سے سوال اٹھ رہے تھے جس کے جواب وہ مجھ سے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ اب ہمارے گھر کے ایک اہم فرد کی طرح تھی۔ اگر وہ مجھ سے کچھ جاننا بھی چاہتی تو مجھے اسے کچھ بتانے میں کوئی حرج محسوس نہ ہوتا' لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ابھی اسے ہمارے ہاں آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو یوں میں اس کے سامنے اپنی زبوں حالی کی روداد کھول کر بیٹھ جاؤں۔ ”آج آپ کی پریذنٹیشن کیسی رہی۔“ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتی میں نے موضوع ہی بدل ڈالا۔

”جی...... دراصل میری باری آنے تک پیریڈ

ٹائم آف ہوگیا تھا' یوں اب میری پریذنٹیشن کل ہوگی۔'' اس نے ایک دم سے چونک کر جواب دیا۔ گویا وہ کسی گہری سوچ میں محو تھی۔ اسے پھر سے خاموش پا کر میں بولا۔

''اب اگر آپ کو کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت ہوتو بولیے گا۔'' وہ میری یہ بات سن کر مسکائی اور کہنے لگی کہ اس نے رومی کو میرے پاس اسی مقصد سے بھیجا تھا۔ پھر وہ مجھے اپنی تیاری سے متعلق آگاہ کرنے لگی۔ اسے سننے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کافی اچھے ذہن کی مالک تھی۔ وہ ہگ بوسون کے اس نئے دریافت ہونے والے ذرے اور اس کی ساخت کو طبعی یا حسابی انداز میں کلیے سے بڑی مہارت سے بیان کرسکتی تھی۔ اس کی تیاری ایک اعلیٰ پریذنٹیشن کے لیے کافی تھیں۔ وہ بول چکی تھی' اب میری باری تھی۔ میں نے فقط اس کی معلومات کی ترتیب کو درست کیا۔ اسے بتایا کہ وہ پریذنٹیشن کا آغاز وہاں سے کرے جب ایک عظیم و عالیشان تقریب کے دوران ہگ اور بوسون ہر رنگ و نسل اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے سامنے بے ساختہ پکار اٹھے تھے۔ ''یس آئی ایم دا بلیور'' ایسا کہتے ہوئے میں اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے سن کر جہاں اسے میری کوئی بات مفید لگتی' وہ اپنے پاس رکھی نوٹ بک میں اسے درج کر لیتی تھی اور جونہی میری بات مکمل ہوئی تو اب وہ مجھے کچھ الگ ہی انداز سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے استفسار پر کہ مجھے یہ سبھی معلومات کیسے حاصل ہوئیں۔ میں نے اسے آج اپنی سوچ کے حوالے سے آگاہ کیا تو ہمیں وہاں بیٹھے وقت کے بیتنے کا جیسے احساس ہی نہ ہوا تھا' اب سورج غروب ہونے کو ہی تھا۔ میرے یومنہ کے ساتھ آ کر بیٹھنے کے بعد مجھے اندازہ تھا کہ اب وہاں کوئی اور نہیں آئے گا۔ بڑے ابا تو دور کی بات بھابی' بچوں تک کو میرے قریب نہ آنے دیتی تھی۔ رومی میاں ابھی دو ماہ کے ہی تھے جب میری طبیعت بگڑ گئی تھی' اور جب میری حالت سنبھلی اور میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کو ذرا سمجھنے کے قابل ہوا تو رومی میاں بڑے ہو چکے تھے اور پھر صائم میاں جو دنیا میں آئے تو میرا کتنا جی چاہتا کہ میں انہیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھاؤں' جب وہ اپنے لڑکھڑاتے قدموں سے میری جانب بڑھے تو اسے گرنے سے پہلے ہی اٹھا کر اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں۔ اوپر ہوا میں جو اچھالوں تو اس کے معصوم قہقہے میرے کانوں میں کیسا سرور بھر دیں اور جو وہ اپنے دودھ کے دانتوں سے میرے ہاتھوں پر کاٹے تو میں اس میٹھے درد کے احساس کو محسوس کرنا چاہتا تھا لیکن بھابی کیا سمجھتی میرے ایسے جذبات کو' ان کے نزدیک تو میں ایک خبطی' جنونی انسان تھا جو کسی بھی لمحے ان کے بچوں کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ''اشھد ان لا الہ الا اللہ'' ایک دم سے میں خیالوں کے دائرے سے پلٹا' مغرب کی اذان شروع ہو چکی تھی اور یومنہ بھی مجھ سے اجازت لے کر جا چکی تھی۔ میں جھٹ سے اٹھا وضو تو تھا ہی وہیں سے سیدھا مسجد کی جانب چل پڑا۔

گھر سے مسجد تک کا فاصلہ اتنا تھا کہ تکبیر تحریمہ کے ساتھ شامل ہونے کے لیے مجھے اذان کہ شروع ہونے سے ذرا پہلے گھر سے چلنا ہوتا تھا اور اب میرے گھر سے نکلنے تک موذن نصف سے زیادہ اذان کہہ چکا تھا۔ یوں میرے مسجد میں پہنچنے تک جماعت کھڑی ہو چکی تھی لیکن مجھے پہلی ہی رکعت میں جا ملنے کا موقع مل گیا تھا۔ فرض نماز کی ادائیگی کے بعد سنتیں اور نوافل ادا کر کے میں رب سوہنے کے برستے نور و انوار میں بھیگنے کے لیے وہیں بیٹھا

رہا۔ بسا اوقات مسجد میں یونہی بیٹھے ہوئے مجھے وہی پہلے ساطہٰ عالم یاد آنے لگتا اور ساتھ ہی مجھے وہ نماز یاد آنے لگتی تھی جو ایک بار میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ ادا کی تھی۔

ایک روز جو ہم دوستوں کا گروپ یونیورسٹی سے نکلا تو ہمیں ہر سمت سے اذان کی آوازیں آتی سنائی دے رہی تھیں۔ اس روز ہمارے ساتھ ایک نیا لڑکا اعظم بھی تھا۔ وہ جو نماز پڑھنے کا عادی تھا' تو اس روز اس نے ہمیں بھی مسجد چل کر نماز ادا کرنے کی دعوت دی۔ اس کی دعوت پر جو میرے دوست مسجد کی جانب بڑھے تو لامحالا مجھے بھی ان کے ساتھ چلنا پڑا تھا۔ وگرنہ میں تو کبھی عید کی نماز ادا کرنے کسی عید گاہ تک بھی نہ گیا تھا۔ میری اس روز ادا کی نماز کی حرکات وسکنات کچھ یوں تھیں جیسے کسی نے چلتی وڈیو کو چار گنا کے حساب سے فارورڈ پر چلا دیا ہو۔ دوسروں کے دو رکعت ادا کرنے تک میں باہر کھڑا اپنے دوستوں کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا اور آج مجھے کیسا سرور ملتا تھا' نماز میں ایک ایک رکعت کو ادا کرنے میں۔ یہی سوچ کر بے ساختہ میرے لب پر ادا ہونے لگا تھا کہ وہی ستار عیوب ہے جو ہماری برائیوں کو اچھائیوں سے بدلتا ہے پھر میں مسجد سے جو باہر نکلا تو میرے دل کی طرح باہر کا موسم بھی بدل چکا تھا۔ گھٹا نے جو برس کر رم جھم سی لگا رکھی تھی تو ساتھ ہی سنسناتی ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ اس برستی پھوار اور رم جھم میں' میں گھر پہنچنے تک کوئی بھیگنے والا نہ تھا' ایسا سوچتے ہوئے میں نے جیسے ہی اپنا پہلا قدم آگے بڑھایا تو تیز ہوا کے جھونکے سے اپنے کاندھوں کے گرد اوڑھی چادر کو میں نے بامشکل کھلنے سے روکا تھا لیکن میں ٹھہرا نہیں اور اب راستہ بھر میں سوچتا چلا جا رہا تھا کہ بابا رب نواز کی دی یہ چادر کیسا طلسماتی چولا ثابت ہو رہی تھی۔ پہلے تو اس نے میرے جسم کو حرارت پہنچا کر میری روح تک کو گرما دیا تھا اور اب چل رہی یخ بستہ ہواؤں کے سامنے بھی ڈھال ثابت ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے یاد آنے لگا کہ بابا رب نواز نے ہدایت کی تھی۔ ''کہ میاں جب اچھے ہو جاؤ تو اسی جگہ آ کر مجھے یہ چادر لوٹا جانا۔'' ایسا یاد آتے ہی میں نے ارادہ کر لیا کہ جواب بڑے ابا ملیں گے تو میں ان سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔

گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ پھر اوڑھی ہوئی چادر پر جو نمی تھی' اسے میں نے جھاڑ کر ایک طرف پھیلا دیا تھا اور بستر پر جو ذرا سی دیر آرام کرنے کو لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ میں نے آواز دی تو بابا عبدالقادر دوا والی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ انہیں کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر میں فوراً ہی اٹھ بیٹھا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب وہ مجھے دوا کھلائے بغیر کمرے سے نکلنے والے نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پھر کسی بھی حجت کے بغیر میں نے دوا کھالی تھی۔

اگلے روز ناشتے کی میز پر یومنہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی موجود تھی اور میرے وہاں بیٹھنے کے بعد مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا دیر نہ لگی تھی کہ میرے پہنچنے سے پہلے وہاں میری ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ یومنہ اپنی پریذنٹیشن کے لیے مجھ سے حاصل ہوئی معلومات سے سبھی کو آگاہ کر چکی تھی۔ پھر ناشتہ کرتے ہوئے وہ یکایک مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''طہٰ آج آپ میرے ساتھ یونیورسٹی چل سکتے ہیں؟'' اس کی بات سن کر فقط میں ہی نہیں باقی لوگوں نے بھی ناشتہ چھوڑ کر یوں حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ جب اس کی بات ختم ہوئی تو میں کیا کوئی جواب

دیتا' بڑے ابا فوراً ہی قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔
''بھئی کیوں نہیں جائے گا۔'' پھر وہ میری جانب مسکا کر دیکھتے ہوئے بولے۔''طٰہ میاں ذرا آج اپنے خاص وقت میں سے کچھ وقت یومنہ بیٹی کے لیے بھی نکال کر اس کی یونیورسٹی چلے جانا۔'' اب کی بار جو بڑے ابا بھی اس کے ہم آواز ہو کر بول پڑے تو پھر میں بھلا ان کی کسی بھی بات کو رد کرنے سے متعلق سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔ یوں میں نے مختصر سا جواب دے کر ہامی بھر لی تھی اور میرے ماں اور ابا یوں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے جیسے آج کوئی ان ہونی ہو گئی ہو۔ ماں نے جواب کی بار میری جانب دیکھا تو وہاں مجھے ممتا کی وہی پیاسی جھلک دکھائی دی۔

مجھے احساس تھا کہ میری ذات سے جڑے ان کے کتنے ارمان تھے' اگر وہ مجھ سے خفا تھے تو یہ بھی ظاہراً ہی تھا۔ میں نے کبھی ان کی بات جو نہ مانی تھی۔ آخر کو تھے تو ماں باپ ہی۔ چاہے میرے ان سے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں وہ مجھ سے کتنا ہی خفا کیوں نہ ہوں' لیکن اس رشتے کی عظمت ان سب باتوں سے بڑی تھی۔

ڈائننگ ہال سے اپنے کمرے میں پہنچ کر مجھے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ میں نے یومنہ کے ساتھ اس کی یونیورسٹی چلنے کے لیے ہامی کیوں بھر لی تھی؟ لیکن بات تو وہاں سے شروع ہوئی تھی جب یومنہ نے مجھ سے اپنی پریذنٹیشن کے لیے مدد چاہی تھی اگر میں اسی روز انکار کر دیتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔

میں جو کہ عرصہ دراز سے ایک تنہائی سی تنہائی کا شکار تھا' تو یہ میرے اردگرد جیسے کوئی مکڑی کا سا جالا بن چکی تھی۔ مجھے اس تنہائی سے پیچھا چھڑانا دشوار معلوم ہوتا تھا' اسی لیے گھر میں یا خاندان بھر کی کسی بھی تقریب میں' میں جانے سے کتراتا تھا۔ بسا اوقات گھر میں منعقدہ کسی تقریب میں' میں بھولے سے پہنچ جاتا تو پھر بھی کو میرا وجود وہاں گراں گزرتا۔ وہ اب اس بات کے عادی ہو چکے تھے کہ میں کسی بھی قسم کی زندگی کی پہلی سی رعنائیوں کا حصہ نہیں بننا چاہتا' یوں وہ مجھے کسی قسم کی مصروفیت سے آگاہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے اور جو کبھی میں ان جانے میں گھر میں منعقدہ کسی تقریب میں اچانک سے جا پہنچتا تو مجھے وہاں پا کر جو ان کا عزوقار مجروح ہونے لگتا تو پھر وہ چاہتے کہ میں جلد سے جلد وہاں سے ہٹ جاؤں۔ اس بات کا مجھے خود بھی احساس ہوتا اور میں وہاں سے ہٹنے میں ذرا وقت نہ لگاتا۔ ابھی اپنے کمرے میں پہنچ کر میں ایسی ہی کشمکش کا شکار تھا کہ یا رب جیسا میں نے حلیہ بنا رکھا ہے اسی حلیے میں' میں اس کے ساتھ چلوں گا تو وہ کیسا محسوس کرے گی۔ یونیورسٹی میں اس کی کلاس میٹس بھی ہوں گی وہ لازماً مجھے ان سے بھی ملوائے گی' تو یوں وہاں اس کا امیج خراب ہوگا اور میں بھلا ایسا کیونکر چاہوں گا۔

ایسا ہی سوچ کر آج عرصہ دراز کے بعد میں ان بند کبرڈ کے پٹ کھولے جہاں وہ سارے ملبوسات میرا انتظار کر رہے تھے جو ماں' ابا اور بھائی میری گزری ہر سالگرہ پر مجھے تحفتاً دیتے آئے تھے' لیکن میں نے ان کو استعمال کرنا تو دور کی بات کبھی ٹھیک سے دیکھا تک بھی نہ تھا پھر جس سوٹ پر آ کر میرا ہاتھ رک گیا تھا' وہ فقط ایک ہی شخص مجھے گفٹ کر سکتا تھا' اور وہ جی ایم تھے۔ بڑے بھائی غلام مصطفیٰ کو میں جی ایم ہی کہہ کر پکارا کرتا تھا' جی ایم میری پسند نہ پسند سے اس قدر واقف تھے کہ بار ہا یوں ہوتا کہ وہ اپنے لیے لایا سوٹ بھی مجھے دے

دیتے کہ میرے تن پر آتے ہی وہ کچھ یوں بچنے لگتا تھا یا یوں کہہ لیں کہ ہم دو بھائیوں میں جو چیز مشترک تھی وہ لباس کی پسندیدگی ہی تھی۔

پھر لباس تبدیل کرنے کے بعد جو ایک اور کام میں نے کیا وہ بابا رب نواز کی دی چادر تھی جسے میں نے رات خشک ہونے کے لیے پھیلایا تھا اور اب ایک بار پھر سے جھاڑ کر تہہ لگا کر اسے اپنے بستر پر رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد میں ڈریسنگ کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا' بال تو خاصے بڑھ چکے تھے اور داڑھی تو میں باقاعدہ رکھ چکا تھا۔ اپنے شانوں تک دراز بال دیکھ کر مجھے کالج کا زمانہ یاد آنے لگا تھا۔ جب ایسے ہی بال بڑھائے میں پونی کیا کرتا تھا۔ پھر یکایک جو میری نظر گھڑی پر پڑی تو میں نے مزید کمرے میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کمرے سے نکل کر جو میں پورچ میں پہنچا تو مائیکل ہمارا ڈرائیور مجھے دیکھ کر جیسے دنگ رہ گیا۔ میں اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہیں ٹھہر گیا۔ تو وہ خوشی سے کیسا سرشار بے قابو ہو کر میری جانب بڑھا چلا آیا تھا پھر میرے قریب پہنچ کر بے ساختہ اس نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا تھا اور جب یومنہ اپنے ہاتھوں میں ایک بڑی فائل اور چند ایک کتابیں اٹھائے پورچ میں پہنچی تو ایسی ہی کچھ ملتی جلتی حالت اس کی بھی ہو رہی تھی۔ اس نے آج پہلی بار مجھے کالی چادر کے بغیر دیکھا تھا۔ جسے میں ہمہ وقت اوڑھے رکھتا تھا۔ ان سب کے علاوہ کوئی اور بھی تھا جو مجھے دیکھ رہا تھا۔ کوئی اور بھی تھا جو آج برسوں بعد مجھے زندگی کی پہلی سی رعنائیوں میں واپس پلٹتا دیکھ کر اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ پایا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ماں اور ابا اپنے کمرے کی اس کھڑکی کے پاس کھڑے جہاں سے پورچ کا سارا منظر واضح دکھائی پڑتا تھا مجھے دیکھ رہے تھے اور اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ میں یہ جاننے کے باوجود بھی نہ پلٹا اور میں نے اس کھڑکی کی جانب نہ دیکھا جہاں وہ کھڑے مجھ پر نہال ہو رہے تھے۔

یومنہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ میں بھی آگے بڑھ کر مائیکل کے مقابل سیٹ پر بیٹھا تو میرے بیٹھتے ہی مائیکل نے گاڑی آگے بڑھادی۔ رم جھم سے شروع ہونے والی بارش رات گئے تک موسلا دھار ہو کر برستی رہی تھی جس کے اثرات ابھی تک جگہ جگہ کھڑے پانی کی صورت میں باقی تھے اور آسمان پر بادل اب بھی کہیں کہیں ٹولیوں کی شکل میں تیرتے دکھائی پڑ رہے تھے۔ پھر جب بھی انہی بادلوں کی کوئی مست ٹولی سورج کے سامنے آ کر اس کی کرنوں کو ڈھانپ لیتی تو کہیں دھوپ تو کہیں چھاؤں کا سا منظر دکھائی دیتا۔

ہماری گاڑی سروس روڈ سے نکل کر اب شہر کی ایک اہم مصروف ترین شاہراہ سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے بیچ بیچ لگے برقی کھمبے جن پر موجود قمقمے رات کو روشن کردیئے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ لٹک رہے فلیکس ابا کی الیکشن کے دنوں چلائی سیاسی مہم کی یاد دلا رہے تھے۔ کبھی ان پر ابا کے ہمراہ میری تصاویر بھی آویزاں ہوتی تھیں لیکن آج میں خود ان کی کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں کا حصہ بننا نہیں چاہتا تھا۔

اب ہم یونیورسٹی پہنچنے والے تھے۔ یونیورسٹی گھر سے کوئی زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم یونیورسٹی جا پہنچے تو مائیکل نے گاڑی پارکنگ ایریا میں جا روکی۔ میں اور یومنہ گاڑی سے اترتے ہی یونیورسٹی کی اندرونی عمارت کی جانب بڑھ چکے تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے اب مجھے کئی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں اور یومنہ مجھے وہیں سے الگ الگ شعبوں سے متعلقہ عمارتوں کا تعارف اشاروں سے کروا رہی تھی۔

کچھ ہی پل میں ہم اس عمارت تک پہنچ گئے تھے جس کے آڈیٹوریم میں یومنہ کی پریذنٹیشن ہونا تھی۔ ہال میں داخل ہونے سے ذرا پہلے میں نے اسے کہا کہ میں اس کے ساتھ آ ہی گیا ہوں تو مجھے واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں۔ ایسا میں نے فقط اس مقصد سے کہا تھا تاکہ وہ اطمینان سے اپنی پریذنٹیشن دے سکے اور جب اس کی کلاس مکمل ہو تو ہم پھر لوٹیں' وہ میری یہ بات سن کر اس قدر خوش ہوئی کہ پھر جھٹ سے بولی۔

''طٰہٰ آپ سے میری چند کلاس فیلو بھی ملنا چاہتی ہیں۔'' اس کی بات سن کر مجھے لگا جو بات اس نے پریذنٹیشن مکمل ہونے کے بعد کہنا تھی وہ پہلے ہی کہہ دی تھی۔ میں فقط اس کی بات کے جواب میں مسکرا دیا۔ اب ہم آڈیٹوریم ہال میں پہنچ چکے تھے اور میں پچھلی کسی نشست پر جا بیٹھا تھا' جب کچھ دیر میں پریذنٹیشن کا آغاز ہوا تو پہلی باری یومنہ کی ہی تھی۔ اس نے بگ بوسون تھیوری کا تعارف کروانا شروع کیا تو اس کا موضوع ہی کچھ اس قدر دلچسپ تھا کہ سارے ہال پر جیسے گہرا سکوت طاری ہو گیا اور میری دی معلومات سے بھی اس نے بھرپور استفادہ حاصل کیا تھا۔ وہ پُراعتماد انداز میں اپنی پریذنٹیشن مکمل کرنے کے بعد واپس اپنی نشست پر جا بیٹھی تھی اور یونہی جب ایک' دو اور لڑکیوں نے بھی اپنی پریذنٹیشن مکمل کر لی تو وہ میرے پاس آ گئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ کہیں میں بوریت تو محسوس نہیں کرنے لگا۔ اس کی یہ بات سن کر پہلے تو میں نے اسے خوش دلی سے سراہتے ہوئے بہترین پریذنٹیشن دینے پر داد دی اور پھر اسے کہا کہ اس کی پریذنٹیشن میں نے دیکھ لی ہے اب اگر پیریڈ ختم ہونے تک میں اسے یہاں بیٹھا نہ ملوں تو میں ہال سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہوں گا۔ وہ میری بات سن کر چلی گئی تو چند لمحوں تک وہی بیٹھے رہنے کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔ امتحانات کے دن ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی تقریباً سنسان دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں کھڑے رہ کر مجھے اپنے یونیورسٹی کے دن یاد آنے لگے تھے۔ میں اچھے ذہن کا مالک تھا' لیکن میری سرگرمیاں اچھی نہ تھیں۔ اگر میں بھی اپنی تعلیم کو سنجیدہ لے کر چلا ہوتا تو اگر آج جی۔ ایم کی طرح پی ایچ ڈی نہ بھی ہوتا تو کم سے کم انجینئر یا وکیل تو ضرور ہوتا۔

جب وقت گزر جاتا ہے تو ہم اسے مقدر میں ہی نہ لکھے ہونے کا راگ الاپتے پھرتے ہیں۔ سارا خطاوار اپنے مقدر کو گردانے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ ہم پر ہی منحصر ہوتا ہے کہ ہم اس خاص وقت کی قدر و اہمیت کو کس حد تک سنجیدہ لیتے ہیں۔ ہم جانتے بوجھتے اس وقت کو بے دریغ غیر معیاری سرگرمیوں میں لٹا دیتے ہیں اور جب وقت اپنی دھیمی دھیمی رفتار سے گزرتا چلا جاتا ہے تو ماضی ایک پچھتاوا بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسی ہی سوچوں کے دائرے سے میں اس وقت پلٹا جب مجھے اپنے عقب سے میٹھی چہکاریاں سی سنائی دیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یومنہ اپنی کلاس میٹس کے ساتھ ہال سے باہر آ چکی ہے اور اب وہ میری طرف ہی آ رہی ہیں' لیکن یہ جاننے کے باوجود بھی میں پلٹا نہیں' پھر ایک ہاتھ میری جانب بڑھا' ہاتھ کی جانب دیکھتے ہوئے جو میں پلٹا تو یہ یومنہ تھی۔ اس کا میری جانب بڑھا ہوا ہاتھ ابھی تک ہوا میں ہی معلق تھا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً مجھے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینا پڑا اور ساتھ ہی میری نظر پاس کھڑی تین اور لڑکیوں پر پڑی۔ میرا ہاتھ ابھی تک یومنہ کے ہاتھ میں ہی تھا۔ جب وہ سرعت

سے بولی۔

"مجھے پریذنٹیشن میں بہت اچھے مارکس ملے ہیں۔ آئی ایم رئیلی تھینک فل ٹو یوطہٰ۔"

اس کی بات سن کر مجھے بہت اچھا لگا اور میں سوچنے لگا کہ ساری محنت تو اس کی اپنی ہی تھی پھر وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے جدا کرتے ہوئے مجھے اپنی کلاس میٹس سے ملوانے لگی۔ جانے وہ انہیں میرے متعلق کیا کچھ بتاتی رہی تھی کہ ان کی باتوں سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی برگزیدہ ہستی ہوں جس کی زبان سے ادا ہوئی ہر بات اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو اور ساتھ ہی مجھے لگنے لگا کہ ہم لوگ کتنے ظاہر پرست ہوتے ہیں۔ بڑھی ہوئی داڑھیاں، لمبی زلفیں اور چہرے پر دکھائی دیتا نور ہی ہمارے نزدیک پہنچے ہوئے لوگوں کی علامتیں بن چکی ہیں۔

پھر باتوں باتوں میں ہی ہم پارکنگ تک پہنچ چکے تھے۔ یومنہ نے اپنی دوستوں کو الوداع کہا اور ہمارے گاڑی میں بیٹھتے ہی مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی پھر جب تک ہم گھر پہنچتے عصر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں یوں گھر سے قریب ہی واقع مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے مائیکل کو روکنے کو کہا اور میرے گاڑی سے اترتے ہی مسجد کی جانب بڑھنے تک مائیکل گاڑی لے کر آگے بڑھ چکا تھا۔



مسجد میں نماز ادا کر کے میں گھر پہنچا تو گھر کے خاص دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے ایک طرف سے بچوں کا شور سنائی دیا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو یومنہ بچوں کے ساتھ لان میں بیڈمنٹن کھیل رہی تھی۔ میرے گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا لیکن میں رکا نہیں بلکہ اسے نظر انداز کیے آگے بڑھ چکا تھا۔ ابھی میں نے چند قدم ہی آگے بڑھائے ہوں گے کہ جب مجھے اپنے عقب سے یومنہ کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے رکنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر مجھے رکنا پڑا اور میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ بچوں کے ساتھ ریکٹ ہاتھ میں تھامے جوشیلے انداز میں میری جانب بڑھی چلی آ رہی تھی پھر میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اس نے کچھ دور سے ہی ریکٹ میری جانب اچھال دی۔

"طہٰ کیچ اٹ اینڈ....." اور باقی کہ چند الفاظ جیسے اس کے حلق میں ہی دب گئے تھے۔ میں اپنی جگہ سے ہلا تک نہ تھا اور نہ ہی اس کے ہوا میں اچھالے ریکٹ کو میں نے آگے بڑھ کر تھامنے کی کوشش کی تھی۔ اسے مہمان سمجھ کر اب تک جو میں نے اس کے ساتھ وقت گزارا تھا تو وہ یوں مجھ سے بے تکلف ہو رہی تھی مجھے اس کی بیڈمینٹن کھیلنے کی آفر پر سخت غصہ آ رہا تھا، اسی لیے میں مزید وہاں اک لمحے کو بھی نہ ٹھہر سکا تھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ میرا ایسا رویہ دیکھ کر جیسے یکایک اس کے چہرے پر بھی پژمردگی سی چھا گئی تھی۔ وہ متعجب ہو کر چند قدم آگے بڑھی جیسے مجھے پھر سے روکنا چاہتی ہو اور پھر وہیں ٹھہر کر اس نے زمین پر گرے ریکٹ کو اٹھایا اور سراسیمہ ہو کر مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر بھی میرا غصہ کم نہیں ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا اور اب خود پر آنے لگا تھا، مجھے دیکھتے ہی اس نے چہکتے ہوئے خوشی سے سرشار کیسے ریکٹ کو میری جانب اچھالا تھا اور اپنے ساتھ کھیلنے کی دعوت دی تھی لیکن میرے نظر انداز کرنے پر پھر اسے کس قدر تکلیف پہنچی ہوگی، ایسا ہی کچھ سوچتے ہوئے میں مضطرب سا ہو کر کبھی آرام کرسی پر جا بیٹھتا تو کبھی بستر پر لیٹ

جاتا اور سوچنے لگتا کہ مجھے اس کے ساتھ ایسا سلوک اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اسے ہمارے ہاں آئے ابھی دن ہی کتنے بیتے تھے اور وہ یوں میری ذات سے قریب تر ہوتی چلی جارہی تھی' میرے ماضی سے جڑی حقیقت کا اسے کچھ تو ادراک ہو ہی چکا ہوگا۔ بڑے ابا سے نہیں' ماں' ابا اور بھائی سے بھی نہیں یا گھر کے کسی ملازم سے نہ سہی وہ اب تک بھابی سے تو جان پہچان بنا چکی تھی وہ اسے میرے متعلق کچھ نہ کچھ تو بتاتی ہوں گی' یوں پھر اسے میرا احترام نہیں کرنا چاہیے تھا' مجھ سے اسے کسی قسم کی کوئی ہمدردی بھی نہیں ہونی چاہیے تھی اور میں کسی قسم کی ہمدردی کے قابل ہی کہاں تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر آبیرہ بھی تو میرے دل سے زیادہ قریب تھی۔

ہم زندگی میں جن دوستوں پر اپنی ذات سے زیادہ اعتبار کرتے ہیں' سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے بنا رہ ہی نہیں سکتے' ہمارے لیے وہ اپنی جان تک دے سکتے ہیں' انہیں ہم سے اس قدر محبت ہے' وہی اپنے بن کر دغا دے جاتے ہیں۔ شاید زندگی کو اسی لیے ایک معلم کی طرح کہا گیا ہے کہ وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ یہ ہمیں کئی طرح کے درس دیتی ہے۔

یونہی وقت نے مجھے بھی ایک ایسی ہی حقیقت سے لذت آشنائی دلائی تھی یہ خیال آتے ہی میں دھیرے دھیرے اپنے ماضی میں اترنے لگا تھا۔

جب ان دنوں مجھ پر اک عجیب سیمابی کیفیت طاری رہتی تھی' مجھ سے سرزد ہوئے گناہوں کا بوجھ مجھے کسی کروٹ چین نہ لینے دیتا تھا اور میں بے کل سا ہو کر یہ سوچ کر گھر سے باہر چلا جاتا تاکہ باہر کی رونق میں کسی طرح سے اپنے دل کو بہلا سکوں' اپنے ضمیر کی آواز کو دبا سکوں لیکن پھر وہی باہر کی رونق میرے لیے عذاب بن جاتی اور میں مضمحل سا ہو کر وہاں سے سیدھا گھر پلٹ آتا' گھر پہنچ کر اپنے کمرے کو مقفل کر کے بستر پر پڑا رہتا اور چند لمحے ہی راحت میں کٹتے کہ پھر سے دھیرے دھیرے میرا کمرہ بازگشت بننے لگتا اور میرے ضمیر کی آہنی ضربیں مجھے بے کل سا کیے دیتیں اور جب یہ خاموشی میں گونجنے والی بازگشت میرے اعصاب پر بھاری ہونے لگتی تو میں سوچنے لگتا کہ کسی سے اپنی کیفیت بیان کروں تو ہوسکتا ہے کچھ راحت نصیب ہو لیکن کہوں تو کسے' ماں اور ابا تو میرا چہرہ تک نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ بھابی اور بھائی بھی مجھ سے خفا تھے۔ اک بڑے ابا ہی تھے تو انہیں میں اپنی بپتا سنا کر مزید آزردہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یونہی ژولیدہ حال ہو کر میں ہیوی بائیک لے کر جو گھر سے نکلتا تو میرا مقصد فقط اپنے کسی دوست سے مل کر دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہوتا تھا۔ اسی مقصد سے پچھلے کئی روز سے میں آبیرہ کے گھر کے چکر لگا چکا تھا اور ہر بار مجھے اس کے گھر کے ملازم سے یہی سننے کو ملتا کہ بی بی صاحبہ گھر پر نہیں ہیں۔

آج میں نے پھر سے اس سے ملنے کی خاطر اپنی بائیک اس کے گھر سے باہر جا روکی تھی۔ سوئچ آف کر کے میں بائیک سے اترنے لگا تو جیسے اپنے پیروں پر لڑکھڑا سا گیا تھا۔ میں نشے میں کب تھا' بلکہ اب تو میں ہر قسم کا نشہ ترک کر چکا تھا۔ پھر شاید یہ ان چیزوں کی طلب تھی لیکن ایسا بھی نہ تھا' میں کئی بار چیلنج کے طور پر نشہ ترک کر چکا تھا اور مجھے ایسا کرنے میں اب مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ یقیناً پھر یہ میرے دل کا بوجھ تھا' یا میرے ضمیر کی آواز تھی' جو اب جاگ چکا تھا اور دل کا بوجھ ایک بھاری نشہ بن کر میرے اعصاب سلب کیے جارہا تھا۔ میں کافی عرصہ تو صبر کرتا رہا خود سے ہی لڑتا رہا۔ بارہا سوچتا رہا کہ اگر میں اپنے ماضی کو بھلا نہ سکوں تو وقت گزرنے

کے ساتھ ساتھ لامحالہ اس کے ساتھ جینا تو سیکھ ہی لوں گا لیکن پھر ہر بیتا دن ہر بیتا لمحہ مجھے پہلے سے بھاری لگنے لگتا تھا۔ اپنے اوپر طاری اسی بوجھ کو کسی طرح سے ہلکا کرنے کی خاطر میں آبیرہ سے ملنے آیا تھا۔ وہ میری یونیورسٹی فیلو تھی۔ ہم لوگوں کی بہت سی شامیں ایک ساتھ گزرتی تھیں۔ اگر ہم یونیورسٹی بھی جاتے تھے تو یہ فقط ملاقات کا ایک ذریعہ ہوتا تھا۔ ہر ہفتہ اور اتوار کی شب جو میرے فارم ہاؤس پر جشن ہوتا تھا تو وہ بھی آبیرہ کے نام ہوتا تھا۔ یکایک مجھے آہنی دروازے کا چھوٹا پٹ کھلنے کی آواز آئی‘ میں بیل بجا کر اب دروازے کے پاس ہی دیوار سے پشت ٹکائے آنکھیں موندے کھڑا تھا۔

”صاحب آپ۔“ ملازم نے باہر نکلتے ہی حیرت سے میری جانب دیکھ کر کہا۔

”مجھے آبیرہ سے ملنا ہے۔“ حیرت زدہ سے کھڑے ملازم کی بات سن کر میں نے جواب دیا۔

”صاحب! آبیرہ بی بی تو سوچکی ہیں۔“ ملازم نے فوراً جواب دیا جسے سن کر میں نے اپنی جیب سے فون نکالا‘ ابھی پونے دس ہو رہے تھے۔ وہ اتنی جلدی سونے کی عادی نہ تھی۔ میں نے سوچا۔

”دیکھنا اگر سوئی ہوئی ہیں تو ابھی جاگ جائیں گی تمہاری بی بی صاحبہ۔“ میں نے فون سے آبیرہ کا نمبر ملا کر اپنے سامنے کھڑے ملازم کو یوں دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جیسے اس کی کوئی چوری پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن شاید وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ آبیرہ نے میرے دو‘ تین بار کال کرنے پر بھی کال وصول نہ کی تھی۔ اب میں ملازم سے کیا کہتا۔ وہ میرے قریب ہی کھڑا یہ دیکھ رہا تھا کہ میرے بارہا کال کرنے کے باوجود آبیرہ نے میری کال ریسیو نہ کی تھی تو اس نے پلٹ کر دروازہ بند کرلیا تھا اور میں بائیک اسٹارٹ کرنے کے بعد جیسے ابھی تک تذبذب کا شکار اوپر بالکونی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

بالاخانہ کی پہلی منزل پر بالکونی سے ملحقہ کمرہ آبیرہ کا ہی تھا جہاں برقی قمقمے بھی روشن دکھائی دے رہے تھے۔ پھر جانے مجھے کیا سوجھی میں نے جو بائیک اسٹارٹ کی تھی تو فوراً ہی بند کرتے ہوئے اسے ذرا پیچھے لے جا کر دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کیا پھر ایک پیر بائیک پر ٹکاتے ہوئے ذرا سا سہارا لے کر میں دیوار پر چڑھا اور اگلے ہی لمحے اندر کود گیا تھا۔

میرے لیے اس انداز میں آبیرہ کے کمرے تک پہنچنا کوئی نئی یا انوکھی بات بھی نہ تھی۔ اکثر عید کا تحفہ اسے میں اسی انداز میں آ کر دیا کرتا تھا لیکن اندر کودتے ہی یکایک جو مجھے اس کے گھر میں موجود سربین ڈاگ کا خیال آیا تو جیسے میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ میں وقت ضائع کیے بغیر ہی جھٹ سے اس پائپ تک جا پہنچا جس کے سہارے مجھے بالکونی تک پہنچنا تھا۔ اوپر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ آبیرہ کے کمرے کی لائٹ آف تھی۔ میں نے بالکونی میں کھلنے والے دروازے کو ذرا سا دبایا‘ وہ اندر سے بند تھا‘ لیکن مجھے اندر سے مدھم سی آواز سنائی دی۔ میں اس آواز کو پہچان گیا تھا۔ وہ آبیرہ کی ہی آواز تھی۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ میں دروازے سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یہاں مجھے اس کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ ابھی تک فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ جب میں نے اپنے کان کھڑکی سے لگا دیئے۔ ”طٰہٰ پاگل ہو چکا ہے۔ داؤد مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی ایسے پاگل شخص کو کسی نے یوں کھلا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ آج

پھر آیا تھا' میرے گھر وہ تو اچھا ہوا جو میں نے پہلے سے ہی ملازم سے کہہ رکھا تھا کہ وہ موقع محل دیکھ کر اسے مناسب جواب دے دیا کرے۔ نہیں تو آج مجھے اس کی ابنارمل باتیں برداشت کرنا پڑتیں۔''

داؤد کو تو میں جانتا تھا' لیکن آبیرہ...... تم ایسی نکلو گی یہ میں نہیں جانتا تھا۔ نہ جانے کیوں میری آنکھیں برس پڑیں یارب...... اور میں اگلے چند لمحوں تک گھٹنوں میں سر دیئے دیوار کا سہارا لے کر وہیں بیٹھا رہا۔

جہاں ایک جانب میں اس کی بے وفائی پر رنجیدہ آنسو بہار ہا تھا تو دوسری طرف آبیرہ اب قہقہے لگا لگا کر داؤد سے باتیں کر رہی تھی جب اس کے قہقہے میرے اعصاب پر بھاری ہونے لگے تو طیش میں آ کر میرا جی چاہا میں کھڑکی یا دروازہ توڑ کر اندر جاؤں اور آبیرہ کا گلا دبوچ لوں اور اس وقت چھوڑوں جب اس بے وفا کے قفس سے روح پرواز کر جائے لیکن اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے میں نے ایسا کوئی قدم اٹھانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جب میرے اپنے مجھ سے روٹھ گئے تھے۔ دوست احباب ساتھی سبھی منہ موڑ گئے تھے اور رہی سہی کسر میرے ضمیر اور دل کی آوازوں نے پوری کر دی تھیں۔ تو ایسے میں آبیرہ نے صحیح ہی تو کہا تھا کہ مجھ جیسے پاگل شخص کو بھلا یہاں کیوں ہونا چاہیے۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے یوں دیوانوں کے سے انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور بائیک واپس گھر کی جانب بڑھا دی۔

اگلے چند روز مجھے شدید بخار نے آلیا۔ اس قدر شدید بخار نے مجھ سے جیسے میری سدھ بدھ ہی چھین لی تھی اور میں کئی روز تک ایسے ہی نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا رہا' پھر مجھے چند روز بعد ذرا ہوش آیا تو میرے سرہانے مجھے بڑے ابا ہی دکھائی دیئے۔ وہ آنکھیں موندے اپنے سر کو دیوار سے ٹکائے ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھے تھے۔ میری وجہ سے ان کا سکون بھی غارت ہو چکا تھا۔ کتنا برا تھا میں یارب مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی۔ میں نے جو لمحہ بھر کو اپنی آنکھیں کھولی تھیں تو بڑے ابا کو یوں بے آرام پا کر مضطرب ہو کر پھر سے موندھ لیں۔

یکا یک مجھے دروازے پر دستک سنائی دی۔ جب دستک مسلسل ہوتی رہی تو میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولنے پر چند لمحوں تک مجھے یونہی محسوس ہوتا رہا جیسے میرا وجود شدید بخار سے تپ رہا ہو۔ میں آنکھیں ملتے ہوئے دروازے تک پہنچا اور دروازہ کھولا تو میرے سامنے یومنہ کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کیوں آئی ہے۔ اس کے سلام کا جواب دیتے ہی میں نے اپنے سخت رویے کی وجہ سے اس کی دل آزاری کے لیے اس سے معذرت چاہی۔ میری بات سنتے ہی وہ میری سوچ کے برعکس فوراً بولی۔

''ارے طٰہٰ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنوں سے بھلا کوئی معذرت کرتا ہے۔ مجھے آپ سے ایک کام تھا۔ میں اسی لیے آئی ہوں۔'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میں یہی سوچ رہا تھا کہ شاید اسے میرے سخت رویے کی وجہ سے دکھ پہنچا ہو گا لیکن اس کے رویے سے مجھے ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی باتوں میں تو کس قدر اپنائیت تھی۔ مجھے خاموش پا کر وہ پھر سے بولی۔

''دراصل اس ویک اینڈ پر چند چھٹیاں آ رہی ہیں۔ جن میں مجھے گھر جانا ہے لیکن اس سے پہلے مجھے کچھ خریداری کرنا تھی۔ اگر آپ میرے ساتھ چل

سکیں تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔" وہ اپنی بات کہہ چکی تھی اور اب میرے جواب کی منتظر کھڑی تھی۔ اس کی بات سن کر میں گم صم سا یہ فیصلہ ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ میں اسے کیا جواب دوں پھر لامحالا جو میں نے ہامی بھر لی تو اس کا چہرہ یوں خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وہ مجھے آج شام کا وقت بتا کر چلی گئی اور میں وہیں چپ چاپ سا کھڑا چند لمحوں تک سوچتا رہا کہ میرے جیسے شخص کے ساتھ وقت بیتانے میں بھی کوئی خوشی محسوس کر سکتا ہے۔ ذرا شام سے پہلے میں ایک بار پھر سے اسی قسم کی کشمکش سے دوچار ہو رہا تھا کبھی تو میرا جی چاہتا کہ میں کوئی بہانہ بنا کر اس کے ساتھ چلنے سے انکار کر دوں یا کہیں باہر نکل جاؤں اور پھر جب دوبارہ اس سے ملاقات ہو تو اسے کہہ دوں کہ مجھے کسی ضروری کام سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ میں یونہی منصوبے بنا رہا تھا کہ جب بابا عبدالقادر یومنہ کا پیغام لے کر میرے کمرے میں پہنچے۔ وہ مجھے کہنے آئے تھے کہ یومنہ پورچ میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہے۔ یوں اب میرا کچھ بھی سوچنا بے کار تھا۔ میں بابا عبدالقادر کے تعاقب میں پورچ تک پہنچا تو یومنہ گاڑی کے پاس کھڑی میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سلام کیا اور میں نے جواب دیتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو اس کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

گھر کے خاص دروازے سے نکل کر ایک طرف کو مڑتے ہوئے میری نظر گاڑی میں نصب میوزک سسٹم پر پڑی جسے کبھی میں گاڑی میں بیٹھتے ہی آن کر لیا کرتا تھا تو خاص قسم کے ووفر سسٹم سے پیدا ہونے والے ارتعاش سے قریبی گھروں کے دریچے اور شیشے لرز اٹھا کرتے تھے اور وقت بے وقت تنگ ہونے پر لوگ مجھے کوستے بھی ہوں گے لیکن آج مجھے ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

گاڑی میں کافی دیر سے خاموشی تھی اور میری نظریں آگے بڑھتی شاہراہ پر ہی مرکوز تھیں۔ جب یکا یک یومنہ نے اس خاموشی کو توڑا۔

"آپ سے ایک سوال پوچھوں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ یومنہ سوال پوچھنے کے لیے آپ کو میری اجازت کی ضرورت نہیں۔" وہ کچھ پوچھنے میں خوف محسوس کر رہی تھی۔ جب میں نے اس کے خدشات دور کرنے کے لیے فوراً جواب دیا۔ میرا جواب پا کر وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ بولی۔

"آپ ہمیشہ عبادت میں کیوں مشغول رہتے ہیں حالانکہ آپ کی عمر کے لوگ تو فرائض تک کی ادائیگی سے دور بھاگتے ہیں؟" یومنہ اپنی بات کہہ چکی تھی اور اب جواب کی منتظر تھی جب کہ میں سوچ رہا تھا کہ ایسا سوال کرنے والی وہ پہلی لڑکی تھی کبھی تو اپنے دل کی کیفیات بیان کرنے کے لیے میں کوئی رازداں ڈھونڈا کرتا تھا اور لوگ مجھ سے دور بھاگتے تھے اور آج جب میں نے چپ سادھ لی تھی تو کسی نے یوں اپنائیت سے کچھ جاننا چاہا تھا۔ جس کا جواب بھی میں پوری ایمانداری سے دینا چاہتا تھا۔

"آپ ہمیشہ عبادت میں کیوں مشغول رہتے ہیں، یہی سوال ہے ناں آپ کا؟" اسے مخاطب کرتے ہوئے میری نگاہیں آگے بڑھتی شاہراہ پر ہی مرکوز تھیں اور بے تحاشا ٹریفک کے درمیان میں مکمل چوکس ہو کر ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ میرے جواب کی منتظر تھی۔ جب کچھ توقف کے بعد میں نے اپنا سلسلہ کلام جوڑا۔

"اچانک سے ظاہر ہو جانے والا ایسا مرض جس

کی شناخت ہی نہ ہو سکے اور آپ کو لگنے لگے کہ اب آپ اس اذیت زدہ کیفیت سے کبھی نکل ہی نہ پائیں گے کیسی تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔ تب آپ کے پاس کرنے کو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ اسپتال کے کسی وارڈ کے بوسیدہ حبس زدہ سے کمرے کے کسی بستر پر پڑے آپ کیا کر سکتے ہیں' فقط اپنی موت کا انتظار۔ قطار در قطار لوگ آپ کے سرہانے بدلتے رہیں گے' روز نئے نئے چہرے آپ کو دکھائی دیں گے بعض آپ کو دلاسہ دیں گے حوصلہ وہمت رکھنے کی تلقین کریں گے اور جاتے ہوئے چند پیسے آپ کے سرہانے رکھ کر چلے جائیں گے۔ یا زیادہ سے زیادہ آپ کا کوئی سگا آپ کے لیے دعا کر دے گا۔ ان قیمتی سانسوں کو جو رب سوہنے نے ہزار نعمت کی طرح عطا کی تھیں۔ میں نے کبھی ان کی اہمیت کو نہ جانا تھا۔ جیسے میں سمجھتا تھا کہ مجھے کیا ہوگا؟ طٰہٰ عالم کے پاس اتنا سب کچھ ہے' روپیہ پیسہ ہے' اثر ورسوخ ہے' مجھے بھلا کیا ہو سکتا ہے' کوئی ہمارے خاندان کی طرف آنکھ اٹھا کر تو دیکھے ہمیں کچھ کہہ کر تو دیکھے اسے میں وہاں پہنچا دوں گا جہاں سے پھر وہ کبھی واپس نہ آ پائے گا۔

میں ساری دنیا میں گھوم پھر سکتا ہوں' بنا روک ٹوک کہیں بھی آ جا سکتا ہوں کسی بھی بڑے سے بڑے ریستوران میں جا کر ٹھہر سکتا ہوں' میں پیسے سے دنیا جہاں کا ہر آرام و آسائش خرید سکتا ہوں' مجھے کیا ہو سکتا ہے؟

کوئی ہے جو ہماری ٹکر میں آ سکے شہر بھر کے لوگ ہم سے ڈرتے ہیں۔ کبھی کسی کی ہمت نہیں ہو سکی کہ کوئی ہمارے سامنے اونچا بول سکے' کوئی ہماری برائی کر سکے۔

شہر میں گزرتے ہوئے ہمیں بڑے بڑے پروٹوکول ملتے ہیں۔ ہمارے لیے شاہراہیں بند کروا دی جاتی ہیں۔ ہم بلٹ پروف گاڑیوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ مجھے ایسے میں بھلا کیسے کچھ ہو سکتا ہے' کیسا نادان تھا' میں کتنا غفلت میں ڈوبا ہوا تھا' پھر اس نے مجھے یہ احساس دلا ہی دیا۔

معالج نے جب جواب دے دیا تو اس کا کہنا یہ بھی تھا کہ آپ چاہے دنیا بھر کے کسی بھی اسپتال میں چلے جائیں وہاں آپ کو یہی جواب ملے گا کہ انہیں کوئی ایسی طبی بیماری نہیں جو ہماری میڈیکل رپورٹس میں ظاہر ہو رہی ہو' یہ بات جان لینے کے باوجود ملک بھر کے کونے کونے میں واقع ہر وہ جگہ جہاں اعلیٰ معالج اور لیب کی سہولیات دستیاب تھیں۔ میرے ٹیسٹ کروائے گئے لیکن کہیں کچھ ظاہر نہ ہوا۔ میں ہر گھڑی ہر لمحہ موت کے منہ سے قریب تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور میڈیکل میں میری اس بیماری کی کوئی شناخت ہی نہ تھی اور ہوتی بھی کیسے یہ بیماری جسمانی ہوتی تو رپورٹس میں اس کی کوئی شناخت ظاہر ہو پاتی۔

یہ تو مجھ سے سرزد ہوئے گناہوں کی سزا تھی جو ناسور بن کر میرے وجود میں ہی نہیں بلکہ میری روح میں اپنا گھر بنا چکی تھی اور جب روح بیمار ہوتی ہے تو دنیا کی کوئی خوردبین اس بیماری کے وجود کو ظاہر نہیں کر پاتی۔

آپ نے یہی دریافت کیا تھا ناں کہ میں ہر وقت عبادت میں کیوں مشغول رہتا ہوں' آج دوبارہ ملی تندرستی مجھے اتنی پیاری ہے کہ میں اپنا ہر لمحہ ہر گھڑی خدا کے حضور عبادت میں گزارنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میری صبح ہو تو خدا کی حمد و ثناء سے ہو۔ رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹوں تو اپنے رب سوہنے کو ہی یاد کرتے ہوئے مجھے نیند آئے اور

نیند میں لاشعوری کیفیت میں بھی میں کسی ایسے خواب میں داخل ہو جاؤں جو مجھے میرے اللہ سے اور قریب کردے۔'' آخری بات کہتے ہوئے میں نے جو سر گھما کر ایک نظر اس کی جانب دیکھا تو وہ بے حس وحرکت حیرت زدہ سی میری جانب دیکھ رہی تھی۔

''طٰہٰ...... آپ سے وہ جرم کیسے سرزد ہوا تھا...... میں جاننا چاہتی ہوں۔'' کچھ توقف کے بعد یومنہ نے یوں ٹھہر ٹھہر کر اپنے سوال کو بیان کیا کہ جس سے مجھے یہ اندازہ کرنے میں ذرا مشکل پیش نہیں آرہی تھی کہ اب وہ میرے گزرے کل کے بارے میں جاننے کے لیے کتنا بے تاب ہو رہی تھی۔

''یومنہ آپ بھول رہی ہیں کہ آپ اس وقت میرے ساتھ خریداری کرنے آئی ہیں اور میرے ماضی سے متعلق بہت کچھ تو آپ پہلے سے ہی جانتی ہیں۔'' میں نے اسے ایسا جواب اس لیے دیا کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اپنے ماضی کے تلخ باب کو کھول کر بیٹھ جاؤں اور میری وجہ سے اس کی خریداری متاثر ہو۔

''اگر میں پہلے کچھ سن چکی ہوں طٰہٰ تو اب مجھے آپ سے جاننا ہے۔'' یومنہ بضد تھی اور درحقیقت میں بھی تو یہی چاہتا تھا کہ کسی کو تو میں بیان کروں۔ اپنے وہ احساسات' کیفیات' وہ گھڑیاں جو مجھ پر قیامت بن کر بیتی تھیں۔ ''میں آپ کو وہ سب بتاؤں گا لیکن یہ ایک طویل داستان ہے۔ ابھی اسے رہنے دیں۔' میرا جواب پاتے ہی وہ فوراً بولی۔

''مجھے ان لمحوں کا انتظار رہے گا طٰہٰ۔'' یومنہ کے جواب دینے تک میں شہر کے ایک بڑے پلازہ کے پارکنگ ایریا میں گاڑی روک چکا تھا۔ یہ شہر کا ایک بڑا اور معروف ترین شاپنگ سینٹر تھا۔ یومنہ اور میں اندر داخل ہوئے' کھلے کھلے چہرے' بیٹھے بیٹھے قہقہے...... سرگوشیاں اور موسیقی کی چھڑی دھنیں ہم جگمگاتی رنگا رنگ دکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے جب یومنہ ایک سن گلاسز والی دکان کے سامنے پہنچ کر رکی اور مجھے لے کر اندر داخل ہوگئی۔ وہ اندر پہنچتے ہی مختلف قسم کے گلاسز دیکھنے لگی۔ مجھے لگا اسے وہ سن گلاسز اپنے لیے لینا تھے لیکن پھر ایک دم سے اس نے ایک گلاسز میری جانب بڑھا دیئے۔ ''یہ آپ کے چہرے پر بہت جچے گا۔'' میں خود بھی گلاسز کا بے حد شوقین تھا لیکن اس کی پسند واقعی لاجواب تھی۔ یہ اوکلے کے سن گلاسز تھے۔ میرے چہرے پر انہیں سجاتے ہی دکان دار لڑکے نے آئینہ میرے سامنے کردیا۔

''صاحب ایک دم دبنگ لگ رہے ہو'' اس کی بات سن کر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''طٰہٰ آپ مسکراتے ہوئے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔'' یومنہ نے مجھے پہلی بار مسکراتے دیکھا تھا اور پھر برجستہ تعریف بھی کردی تھی۔ میرے اصرار کے باوجود اس نے گلاسز کے پیسے مجھے نہیں دینے دیئے تھے اور انہیں خریدنے کے بعد ہم وہاں سے آگے بڑھے۔

جب یومنہ نے اپنی خریداری مکمل کرلی تو پھر چلتے چلتے میں ایک دکان کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا تھا اور میرے ساتھ چلتے ہوئے وہ اس دکان میں داخل ہوئی تو متعجب سی ہو کر میری جانب دیکھ رہی تھی۔ جیسا کہ دکان میں داخل ہوتے ہوئے وہ باہر کانچ کے باکس میں سجی ڈمیوں سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ یہ حجاب' اسکارف اور اوعبایا جیسے خواتین کے اسلامی لباس کی دکان تھی۔ اندر پہنچ کر میں نے ایک عبایا خریدا' وہ ساتھ کھڑی کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ جب پیسے ادا

کر کے میں نے وہ عبایا اسے دیتے ہوئے کہا۔
"یومنہ آپ کو یہ میری طرف سے گفٹ ہے۔"
اسے میرا یہ تحفہ لیتے ہوئے کچھ وقت لگا۔ وہ حیرت زدہ سی جیسے اسے لیتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب مسکراہٹ بھی کچھ پھیکی پھیکی سی لگ رہی تھی۔ گویا اسے کچھ بہت اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔
ہم دکان سے نکلے اور پھر اس پلازہ کے اس خاص دروازے کی جانب بڑھے جہاں سے ہمیں باہر نکلنا تھا۔ وہ اب چپ چاپ سر جھکائے جیسے کچھ سوچتی ہوئی میرے ساتھ چل رہی تھی۔ ہم دروازے تک پہنچے اور پھر میں وہیں ٹھہر گیا۔ اس جگہ میرے ساتھ کوئی واقعہ بیت چکا تھا۔ میری کوئی یاد اس جگہ سے جڑی تھی، پھر کوئی جھماکا سا ہوا اور میرے گردونواح کا منظر تیزی سے بدلنے لگا اور اب میں جس منظر میں اتر چکا تھا' یہ اسی سلسلے کی اگلی کڑی تھی' جب یومنہ کے دروازہ کھٹکھٹانے پر میں خیالوں کے دائرے سے پلٹا تھا۔
چند روز تیز بخار میں مبتلا رہنے کے بعد جو میری طبیعت میں کچھ بہتری آئی تو بڑے ابا نے مجھے مائیکل کے ساتھ باہر گھوم پھر آنے کو بھیج دیا تھا اور اس روز کچھ خریدنے کی غرض سے میں اسی پلازہ میں آیا تھا۔
یہاں اسی جگہ میں نے آبیرہ کو داؤد کے ساتھ خریداری کرتے دیکھا تھا۔ انہیں ایک ساتھ دیکھ کر میرا جوان خون کھولنے لگا تو میں خود پر قابو نہ رکھ پایا تھا۔ میں دوڑا اور اس سے پہلے کہ میں ان تک پہنچتا آبیرہ نے یوں غصے سے مجھے اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا' داؤد اس سے کچھ فاصلے پر آگے آگے چل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ داؤد کی جانب دوڑی اور اسے داؤد کی طرف بڑھتے دیکھ کر مجھے لگا میں انگریزی فلم ورلڈ وارزی کا وہ وائرس زدہ انسان ہوں جس سے بچنے کے لیے وہ بھاگ رہی تھی حالانکہ میں تو فقط ایک بار اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آبیرہ اگر آج میں کوئی دیوانہ یا خبطی انسان ہوں تو ہمیشہ ایسا تو نہ تھا' پھر کیا ہوا جو آج تم مجھ سے یوں نگاہیں بدلنے لگی ہو۔ میری اس چاہت' پیار اور محبت کو بھلا کر آج تم مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو۔ میرے اس تک پہنچنے سے پہلے اب داؤد میرے سامنے کھڑا تھا۔ "میرے سامنے سے ہٹ جاؤ داؤد۔" میں نے غصے سے چیختے ہوئے داؤد سے کہا اور اس نے اگلے ہی پل مجھ پر ہاتھ اٹھا دیا۔ میں تو پہلے سے ہی غصے سے پاگل ہو رہا تھا' اس کے ہاتھ اٹھاتے ہی اپنے آپے میں نہ رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اب اس کی گردن میرے بازوؤں کی گرفت میں تھی اور وہ چھڑوانے کی لگاتار کوشش میں تھا۔ میں اس کی گردن کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں لیے اس پر ایک ہاتھ سے گھونسوں کے وار کیے جا رہا تھا اور چند لمحوں میں ہی ہمارے اردگرد لوگوں کا ایک بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ ہم پلازہ کے بیرونی دروازے کے سامنے ہی گتھم گتھا تھے۔ جہاں چند گارڈ بھی کھڑے تھے پہلے تو چند ایک لوگوں نے آگے بڑھ کر چھڑانے کی کوشش کی لیکن تب تک میں داؤد کی خوب درگت بنا چکا تھا اور خون اس کے چہرے سے رسنے لگا تھا۔ جب لوگ ہمیں الگ کرنے میں ناکام رہے تو پھر گارڈز نے مجھے داؤد سے جو الگ کیا تو میں پھر کر ان دو گارڈز سے چھوٹ کر پھر سے داؤد کو دبوچ لیتا اور وہ پھرتی سے آگے بڑھ کر مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسی بیچ آبیرہ کا بھی برا حال ہو رہا تھا۔ وہ داؤد کو مجھ سے بچانے کے لیے لوگوں کو پکارتی رہی۔ اس سے پہلے کہ میں پھر سے

چھوٹ کر داؤد اور آبیرہ تک جا پہنچا گارڈز مجھے ان سے دور لے گئے تھے اور ساتھ ہی چند لمحوں میں پولیس کی گاڑی کے سائرن سنائی دینے لگے تھے۔ مائیکل پارکنگ میں کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا اور پولیس مجھے گاڑی میں بٹھا کر تھانے لے جا رہی تھی۔ جب پولیس کی گاڑی میں، میں بے حس و حرکت بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے مائیکل پارکنگ میں گاڑی کے پاس کھڑا سگریٹ پیتا دکھائی دیا لیکن اسے چند لمحوں پہلے ہوئے اس حادثے سے آگاہ کرنے سے زیادہ مجھے فکر اس بات کی تھی کہ میری ایسی حرکت سے اب بڑے ابا کو کس قدر تکلیف پہنچے گی۔

''طٰہٰ...... طٰہٰ آپ ٹھیک تو ہیں۔'' مجھے دور کہیں فاصلے سے کوئی آواز آتی سنائی دی۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی یومنہ میرا بازو تھامے آوازیں دے رہی تھی۔ جنہیں سن کر پاس کھڑے چند ایک لوگ بھی مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے اور میں جیسے منوں بھاری وجود کو گھسیٹ کر یومنہ کے ساتھ چلنے لگا۔ اس گھڑی مجھے دیکھنے والے لوگ یہی سوچ رہے ہوں گے کہ میں کوئی سائیکالوجی کے کسی دماغی مرض کا شکار ہوں۔ یومنہ ایک ہاتھ میں شاپنگ بیگز پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے میرا ایک بازو تھامے مجھے پارکنگ ایریا تک لے گئی تھی۔



گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ میرے لباس تبدیل کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی بابا عبدالقادر کمرے میں آئے۔ وہ مجھ سے کھانے سے متعلق دریافت کرنے آئے تھے، بھوک محسوس نہ کرنے پر میں نے انہیں کھانا لانے سے منع کر دیا تھا اور وہ مزید کسی بھی سوال و جواب کے خاموشی سے کمرے سے چلے گئے تھے۔ بڑے ابا کی طرح بابا عبدالقادر بھی مجھے خوب سمجھتے تھے۔ مجھے کچھ کچھ یاد ہے جب میری طبیعت بگڑ جاتی تو میری ویسی حالت دیکھ کر وہ پاس کھڑے کیسے رویا کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ آج جو میں اپنے پیروں پر چلنے پھرنے اور خود زندگی گزارنے کے قابل ہو پایا تھا تو اس میں بابا عبدالقادر کی وہ چھپ چھپ کر روتے ہوئے مانگی دعاؤں کا کتنا اثر شامل تھا۔

ایسے ہی سوچتے ہوئے میری نظر بابا رب نواز کی دی چادر پر پڑی، مجھے یاد آیا کہ میں کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کسی روز بڑے ابا کے ساتھ جا کر میں یہ چادر بابا جی کو لوٹا دوں لیکن بارہا چاہنے کے باوجود کوئی نہ کوئی کام آڑے آ ہی جاتا یا کبھی یہ بات میرے ذہن سے محو ہو جاتی تھی۔ ابھی رات کافی بیت چکی تھی۔ بڑے ابا اب سو چکے ہوں گے یہ سوچ کر میں نے ان کے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ پھر یونہی میرے ذہن میں ایک دم سے ایک سوال اٹھا۔ آج یومنہ کے ساتھ خریداری کرتے ہوئے میں نے اسے عبایا تحفتاً دیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اسے میرے اس تحفے سے کچھ زیادہ خوشی نہیں ملی تھی اور میرے ذہن میں اس وقت یہی چل رہا تھا کہ کیا وہ میرے اس تحفے کو اسی مقصد سے استعمال کرے گی جس مقصد کے تحت میں نے اسے وہ تحفتاً دیا تھا؟ یا پھر وہ اسے کہیں سنبھال کر رکھ دے گی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے استعمال کرے گی بھی یا نہیں لیکن میں اتنا ایمانداری سے کہہ سکتا تھا کہ میں نے اسے جو تحفتاً عبایا لے کر دیا تھا ایسا میں نے بالکل درست کیا تھا اور شاید یہ مجھے اس لیے بھی درست لگنے لگا تھا کیونکہ اس سے پہلے بھی ایک لباس ہی تحفتاً دینے پر میں نے کسی کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ ایک وہ بھی لباس ہی تھا اور ایک یہ بھی لباس ہی تھا لیکن

دونوں میں اتنا ہی فرق تھا جتنا اچھائی اور برائی میں جیسے کسی سیاہ اور سفید میں......!

دسمبر کی انیس تاریخ میں کبھی نہیں بھولتا تھا اور اس سال بھی دسمبر کی انیس تاریخ میں چند روز ہی باقی تھے۔ میں آبیرہ کو ہر سال مہنگے سے مہنگا تحفہ دینے کی کوشش کرتا تھا اور اس سال بھی میں اسے کوئی خوبصورت اور مہنگا ترین تحفہ دینا چاہتا تھا۔

دسمبر کی دودھیا سفید کہر سے لپٹی سرد شام میں میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ اسے اس سال میں ایسا کیا تحفہ دوں۔ وہ کیا خاص چیز ہونی چاہیے جو پچھلے چند سالوں میں میرے دیئے تحائف سے الگ ہو' میں آبیرہ سے بے حد محبت کرنے لگا تھا۔ ویسی ہی محبت جیسی میری عمر کے نوجوان اکثر اس عمر میں کرنے لگتے تھے۔ میں ارادہ کر چکا تھا کہ اس سالگرہ کے بعد میں اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنالوں گا' اور میرے ذہن میں یہ بھی چل رہا تھا کہ مجھے جلد سے جلد اپنے ماں اور ابا سے اس سلسلے میں بات کرنی چاہیے۔ آبیرہ جیسی چندے آفتاب چندے مہتاب اور ایک اونچے گھرانے کی لڑکی کے رشتے سے وہ بھلا کیونکر انکار کریں گے یہ سوچ کر میں ان کی طرف سے بھی مطمئن ہو جاتا تھا۔ دسمبر کی آخیر سیاہ راتیں ہر طرف چھائی گاڑھی دھند درختوں سے جھڑتے زرد پتے اور اس عالم اداسی میں' میں دفعتاً اچھل پڑا۔ دودھیا سفید پیرہن جسے پہن کر وہ کوئی اپسرا لگے' ایک ایسا لباس جو آبیرہ جیسی شخصیت کے شایان شان ہو' جسے وہ پہن کر جب اپنی سالگرہ کا کیک کاٹنے کے لیے سبھی کے سامنے آئے تو تقریب میں مدعو لوگ اسے دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔ وہ طٰہٰ عالم جس پر شہر بھر کی لڑکیاں فدا تھیں۔ اس کے ساتھ دو گھڑی بیتانے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتی تھیں۔ وہ سبھی دیکھ سکیں کے خود طٰہٰ عالم کس پر فدا ہے۔

پھر جتنا میرے لیے کٹھن یہ سوچنا تھا کہ میں اسے تحفے میں کیا دوں' اس سے کئی گنا دشوار اس لباس کو کھوجنا تھا۔ اگلے دو روز میں نے وہ لباس کھوجنے میں لگا دیئے تھے۔ پھر شہر کے ایک بہترین ڈیزائنر کا ہی تیار کردہ وہ لباس تھا جو کہ ابھی تک کسی بھی ماڈل کے تن پر نہ سجا تھا اور نہ ہی کسی ماڈل نے ریمپ پر چل کر اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈیزائنر نے مجھ سے اس لباس کی قیمت چار گنا کے حساب سے زیادہ وصول کی تھی۔

اسے لے کر میں گھر پہنچا اور گھر پہنچتے ہی میں نے آبیرہ کو فون لگایا۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا' کہ وہ اپنی اس سالگرہ پر میرا تحفتاً دیا لباس پہنے اور اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ میں اسے یہ لباس ابھی پہنچا دیتا کیونکہ آج رات ہی اس کی سالگرہ تھی۔ چند ایک بیل جانے پر ہی اس نے کال ریسیو کی اور اس کے کال ریسیو کرتے ہی میں اسے بتانے لگا کہ کتنی ہی جدوجہد کے بعد مجھے وہ تحفہ ملا ہے جو میں تمہیں اس برتھ ڈے پر دینے والا ہوں۔

''ایسا کیا خاص گفٹ ہے طٰہٰ؟'' آبیرہ جاننے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔

''خاص تو وہ تب ہوگا جب تم اسے پہنو گی۔'' جب میں نے اسے ڈیزائنر کا نام بتایا تو اب وہ اس لباس کو دیکھنے کے لیے بے تابی کا اظہار کرنے لگی اور میں نے اسے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ چند ہی گھڑیوں تک میرا ڈرائیور وہ لباس لے کر تمہارے گھر پہنچ رہا ہے' اور پھر لباس کے ملتے ہی آبیرہ کی کال آ گئی۔ وہ لباس اسے بے حد پسند آیا تھا اور یہ جان کر میں اسے کہنے لگا کہ میں اس کی خوشی کے لیے ایسے کئی لباس تحفے میں دے سکتا ہوں۔ اس کے کال بند کرنے سے پہلے میں

نے اس سے دہرا کر پوچھا کہ آج شام داؤد بھی آ رہا ہے ناں اور اس کی ہاں پر میں مطمئن ہو گیا تھا۔ داؤد آبیرہ کا پرانا بوائے فرینڈ تھا لیکن میرے آبیرہ کی زندگی میں آ جانے کے بعد وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ آبیرہ فقط مجھے چاہتی ہے اور میں بھی آبیرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آبیرہ سے بات ختم ہونے کے بعد کئی ایک اور دوستوں کو بھی میں نے کال کر کے دہرایا کہ وہ آج رات آبیرہ کی سالگرہ پر آ رہے ہیں ناں۔ میں چاہتا تھا کہ سبھی دیکھ لیں کہ طٰہٰ عالم جسے شادی کے لیے منتخب کر چکا ہے۔ وہ لڑکی شہر بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

اور اب مجھے بڑی بے تابی سے اس وقت کا انتظار تھا۔ جب آبیرہ میرا تحفتاً دیا لباس پہن کر تقریب میں مدعو لوگوں کے سامنے آئے اور میں آبیرہ کی بجائے ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جب وہ مسحور ہو کر آبیرہ کو دیکھ رہے ہوں۔ جب اس کی ہم عصر لڑکیاں اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں اور میرے وہ دوست جن میں آبیرہ کا پرانا بوائے فرینڈ داؤد بھی شامل تھا۔ آبیرہ کو دیکھ کر میری قسمت پر رشک کریں۔ اس سالگرہ پر میں اپنے ماں، ابا اور بھائی کو بھی خصوصاً اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اگر میری کوئی بہن بھی ہوتی تو اسے میں یہ ضرور کہتا کہ آج وہ اپنی ہونے والی بھابی سے ملنے جا رہی ہے۔

اس روز سرِ شام ہی مجھے آبیرہ کی فون کالز آنا شروع ہو چکی تھیں۔ کیونکہ پچھلی ہر سالگرہ پر میں دن کے آغاز سے رات تقریب کے اختتام تک اسی کے ہمراہ رہتا تھا لیکن آج میں عین اسی وقت پہنچنا چاہتا تھا، جب وہ سجی سنوری بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ وہ مجھے فون پر فون کرتی رہی اور میں اسے ٹالتا رہا۔ جی۔ ایم اس وقت میرے ساتھ میرے کمرے میں ہی موجود تھے۔ وہ آبیرہ کے برتھ ڈے پر میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو رہے تھے اور آبیرہ کی میرے فون پر آتی کالز کو لے کر مجھے خوب ستا رہے تھے۔ پھر ان کی تیاری کو دیکھتے ہوئے میں بھلا کیسے پیچھے رہتا۔ ”کیوں جناب میرا تو وہاں کوئی انتظار کر رہا ہے، آپ یوں پرتکلف تیاری کے ساتھ کس کے لیے جا رہے ہیں۔“ جی ایم میری بات سن کر فقط مسکراتے ہوئے آئینے کے مقابل کھڑے ٹائی کی ناٹ کو اپنی جگہ پر جماتے رہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک Sophisticated انسان تھے۔ آئینے کے سامنے سے ہٹ کر میرے پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے بالوں کو چھوا جو اب بے ترتیب ہو چکے تھے۔ میں جھٹ سے اٹھ کر ڈریسنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بال بنانے لگا تھا۔ تبھی بابا عبدالقادر ماں اور ابا کا پیغام لے کر آئے تو ان کے کمرے سے نکلتے ہی ہم ان کے تعاقب میں پورچ تک پہنچ گئے تھے۔ جہاں ماں، اور ابا پہلے سے کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یوں ہمارے پہنچتے ہی سبھی گاڑی میں سوار ہوئے اور مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

آج شہر بھر میں دھند کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ ایسا دیکھ کر میرا موڈ کچھ آف ہو رہا تھا۔ مجھے دھند بے حد پسند تھی۔ دھند سے ماحول میں اک عجیب سا افسوں بھر جاتا تھا۔ جو کہ مجھے بہت بھاتا تھا۔ جاڑے میں اکثر ہر طرف چھائے گاڑھے کہر میں، میں اوور کوٹ کے کالر اوپر کانوں تک چڑھائے سگریٹ سلگائے گھر سے پیدل چلتا، کہیں دور نکل جایا کرتا تھا اور جب سے آبیرہ میری زندگی میں آئی تھی میری دسمبر کی ہر دودھیا سفید شام اسی کے سنگ گزرتی تھی اور میں

آج بھی اسے چار سو پھیلے دودھیا سفید آنچلوں کے درمیان ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

آبیرہ کے گھر پہنچتے ہی اسے میرے آنے کی خبر ہوچکی تھی اور میری نگاہیں بھی اسے ہی ڈھونڈ رہی تھیں جب مجھے اس کا پیغام فون پر موصول ہوا۔ وہ میرے دیر سے آنے کی وجہ سے خفا تھی' پہلے تو میں نے اسے انتظار کروایا تھا اور اب وہ مجھے انتظار کی سولی پر لٹکانا چاہتی تھی یوں سبھی بیٹھے مہمانوں کے ساتھ میں بھی اس کا انتظار کرنے لگا۔ میری طرح اسے بھی دسمبر کی سردی اور دھند بہت پسند تھی یہی وجہ تھی کہ کسی پانچ ستارہ ہوٹل بک کروانے کی بجائے اسی کی خواہش پر گھر کے لان میں ہی سارے انتظامات کیے گئے تھے' ہر میز کے قریب ہی چند فٹ اونچے گیس ہیٹر نصب کردیئے گئے تھے جن سے نکلنے والی سنہری کرنیں نہ صرف ماحول کو حسین بنارہی تھیں بلکہ ان سے نکلنے والی حرارت ماحول کو گرما بھی رہی تھیں۔

انہی دنوں ماں اور اباجی ایم کے لیے رشتہ بھی تلاش کررہے تھے اور ایسی تقریبات ہمارے اونچے گھرانوں کے لیے ایک نادر موقع ہوا کرتی تھیں۔ ماں اور ابا تقریب میں مدعو لوگوں سے بھائی کا تعارف کروارہے تھے اور بھائی بھی خوش دکھائی دے رہے تھے۔ یکا یک ہی ہلکے قہقہے اور سرگوشیاں بھی تھم گئیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سبھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں جانتا تھا کہ تم ہی ہو' میں اپنی نشست سے اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور آبیرہ کو دیکھتے ہی مسکاتے ہوئے میرے لبوں سے یہ الفاظ ادا ہوگئے جنہیں میرے سوا کسی نے نہ سنا ہوگا۔

دودھیا سفید پیرہن پہنے وہ کوئی سفید گلاب ہی لگ رہی تھی۔ ڈیزائنر نے تو فقط اس لباس کو

تراشا تھا۔ آبیرہ کے جسم پر آتے ہی جیسے اس میں روح پڑ گئی تھی۔ شاید ہی آبیرہ کو آج سے پہلے کسی نے یوں اس روپ میں دیکھا ہو۔ اب سبھی اپنی اپنی نشست پر بیٹھ چکے تھے۔ میں اسے وش کرنے کے لیے آگے بڑھا اور پھر کسی کو دیکھ کر میں وہیں رک گیا۔ داؤد ابھی تک کھڑا تھا اور میں بھی کیسا غیور تھا۔ آبیرہ کو لوگوں کے سامنے ننگا کھڑا کر کے اب خود کو داد دے رہا تھا۔ طٰہٰ عالم دیکھ ادھر کیسی آگ بھڑک رہی ہے' میں نے قریب پہنچ کر داؤد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر اسی جگہ سے کھڑے ایک بار آبیرہ کی جانب دیکھا وہ اس وقت میرے ماں' ابا اور بھائی سے ہی مل رہی تھی۔ ماں کے اردگرد نگاہیں دوڑا کر مجھے تلاش کرنے سے یونہی لگ رہا تھا کہ وہ ان سے میرے متعلق ہی دریافت کر رہی تھی۔ ادھر میں نے داؤد کے کاندھے پر جو ہاتھ رکھا تو وہ ہڑبڑا کر مڑا' اس کے مڑ کر مجھے دیکھنے پر میں نے طنزاً دو ایک بار اس کے کاندھے کو تھپتھپایا لیکن ایسا کرنے سے شاید انجانے میں' میں اس کے جذبات کو ہوا دے رہا تھا۔ اس کے سینے میں لگی آگ کو بڑھا رہا تھا۔ وہ جواب تک کھڑا آبیرہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا' میں اسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ وہ میری ہے۔

میرا آبیرہ کو ایک ایسا لباس تحفتاً دینا جو اس کے بدن کے برہنہ ہونے کا سبب بن رہا تھا اور پھر ڈھٹائی بے حیائی کے ساتھ یہ سوچنا کہ یوں لوگ میری قسمت پر رشک کر رہے ہوں گے' کس قدر رذیل پن تھا۔ میرے ایسے فیل کرنے کی ایسی ہی سزا ہونی چاہیے تھی۔ آبیرہ...... آبیرہ ...... میں آگے بڑھا' نہ جانے کہاں سے اس قدر شدید دھند چارسو پھیلنے لگی تھی۔ ابھی تو نا تھی' میں نے سر گھما کر دائیں بائیں دیکھا' ابھی میرے قریب ہی داؤد کھڑا تھا'

تقریب میں مدعو لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ روشنی اور حرارت کے لیے لگے لیمپس' کرسیاں' میز مجھے وہاں کچھ بھی تو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شدید سرد دھند میں جیسے میرا وجود منجمد ہونے لگا تھا۔

میں یہ دیکھ کر بے تاب ہو کر چلانے لگا۔ آبیرہ ......آبیرہ...... کہاں ہو تم' دیکھو میں یہاں ہوں۔ میں تمہارے گھر کے صحن میں ہی تو کھڑا ہوں پھر تم کہاں چلی گئیں' باقی سب کہاں چلے گئے' میں طٰہٰ عالم ہوں جس سے تم محبت کرتی ہو۔ میں تمہارا طٰہٰ عالم ہوں' اللہ اکبر' اللہ اکبر' کہیں دور موذن نے صدا بلند کی' میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ'' میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں'' میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ میں کب طٰہٰ عالم ہوں؟ میں کب اس نام کے قابل ہوں؟ میں کب طالب ہدایت ہوں۔ میں تو انسان کہلوانے کا بھی حق دار نہیں ہوں۔ کیا انسان ایسے ہوتے ہیں؟ کیا انسان اپنی عزت کو یوں سر بازار نیلام کیا کرتے ہیں؟ کیا وہ جسے محبت کرتے ہیں' اسے لوگوں کے سامنے یوں نمائش کے طور پر پیش کیا کرتے ہیں۔ ہرگز نہیں' میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا' اور اب زاروقطار رو رہا تھا۔

موذن فجر کی اذان دے کر خاموش ہو چکا تھا۔ دور کہیں سے کچھ دیر سے شروع ہونے والی اذان کی مدھم آوازیں بھی اب آنا بند ہو چکی تھیں اور میں بھی رو دھو کر اب یوں شانت ہو چکا تھا جیسے تالاب میں پھینکے پتھر سے پیدا ہونے والی لہریں دھیرے دھیرے کنارے تک پہنچنے سے پہلے ہی مٹ جاتی ہیں۔ فجر کی جماعت میں اب کم ہی وقت رہ گیا تھا۔ میں نے جھٹ سے اٹھ کر وضو کیا اور پھر بابا رب نواز

کی دی چادر کو جو کھول کر کاندھوں کے گرد اوڑھا تو وہی لاہوتی سی مسحور کن خوشبو نے میرے ذہن سے سبھی کچھ بھلا دیا تھا۔ چند ثانیے میں اسی خوشبو کے سحر میں جکڑا وہیں کھڑا رہا اور پھر مسجد کی جانب چل پڑا۔

مسجد پہنچ کر فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد میں وہیں مسجد میں بیٹھ گیا تھا اور پھر اشراق کی نماز ادا کرنے کے بعد میں جو گھر لوٹا تو اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے ماں کی آواز سنائی دی۔

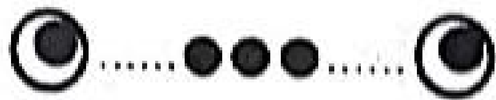
''رک جاؤ طٰہٰ بیٹا'' میں وہی رک گیا لیکن پلٹا نہیں۔

''کیا ابھی تک ہم سے خفا ہو بیٹا؟'' ماں نے میرے قریب آ کر پیار سے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوتے ہوئے کہا اور میں سوچنے لگا' آپ سے نہیں ماں' میں تو اپنے آپ سے ہی خفا ہوں۔ مجھے بالکل چپ چاپ کھڑا پا کر وہ خود ہی دوبارہ بولیں۔

''چلو میرے ساتھ میرے کمرے میں آؤ' مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔'' اور پھر ماں میرا بازو تھامے یوں آگے بڑھی اور میں ان کے ہمراہ یوں چلنے لگا جیسے کوئی ننھا بچہ ماں کی انگلی تھامے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔

اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے ماں مجھ سے کئی باتیں کرتی رہی اور میں ان کی باتوں کا فقط ہاں ناں میں ہی جواب دیتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت کمرے میں ابا بھی ہوں گے اور ماں مجھے ابا سے ہی ملوانے لے جا رہی تھیں۔ اول تو ابا کے پاس کبھی میرے لیے کوئی وقت ہی نہ ہوتا تھا' اور کبھی جو وہ میرے پاس بھولے سے آ بھی جاتے تو چند سوال پوچھتے جن کے میری طرف سے مناسب جواب نہ ملنے پر الٹے پیروں لوٹ جاتے تھے۔

یکایک دروازے سے باہر پہنچ کر میں رک گیا۔ ''چلو بیٹا رک کیوں گئے؟'' ماں نے میرے رک جانے پر حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ماں کو یونہی ششدر کھڑا چھوڑ کر میں پلٹا مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر ماں مجھے روکنے کے لیے چند قدم پیچھے آئی اور پھر مضمحل سی وہی کھڑی مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔



اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے میرے ذہن میں یہی چل رہا تھا کہ اگر میں ماں کے ساتھ اندر کمرے میں چلا جاتا تو ابا مجھ سے کیسے پیش آتے۔ ضرور وہ مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر رہ جاتے۔ آخر کو ان کا جواں سالہ بیٹا یوں دنیا جہان سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ جوان کی سیاست میں ان کا ایک بازو بنا ساتھ کھڑا رہتا تھا۔ اب خود کو ہی سنبھالنے کے قابل نہ رہا تھا۔

وہ مجھ سے کئی طرح کے سوال کرتے اگر میں انہیں ان سوالوں کے تسلی بخش جواب دیتا چلا جاتا تو پھر وہ مجھے کہتے برخوردار کل فلاں جگہ جلسہ ہے' پرسوں فلاں شہر جانا ہے' اور ترسوں فلاں مجمعے کے سامنے تقریر کرنی ہے۔ یہ سب سنتے ہی مجھے نعروں کا بلند ہوتا شور سنائی دیتا۔ اسپیکروں سے نکلتی میری ہی آواز مجھے بازگشت کی طرح سنائی دینے لگتی۔ میرے اطراف میں دیجور آندھی چلنے لگتی۔ اخبارات کے صفحات ہوا میں گرد کی طرح اڑنے لگتے۔ میرا حلق خشک ہونے لگتا اور کبھی میں اپنا سر تھام لیتا۔

دفعتاً میں چلتے چلتے رک گیا تھا۔ یہ بڑے ابا کے کمرے کا دروازہ تھا۔ میں نے دروازہ دھیرے سے کھولا اور اندر داخل ہو گیا تھا۔ بڑے ابا اس وقت ذرا استراحت کو لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے کی

جانب مسکراتے ہوئے دیکھ کر میں ان کے پیروں میں بیٹھ گیا تھا۔ پھر جیسے ہی میں نے ان کے پیر دبانے کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ فوراً ہی جاگ گئے۔

''طٰہٰ میاں آج صبح صبح کیسے آنا ہوا؟'' انہوں نے آنکھیں بند ہی رکھی اور مجھے پیر دابنے سے منع کیے بغیر سوال کیا۔ وہ جانتے تھے کہ میں ان کے منع کرنے کے باوجود پیر دابنے سے رکنے والا نہ تھا۔ میں ان کا سوال سن کر بھی چند لمحے خاموش رہا اور وہ بھی آنکھیں بند کیے میرے جواب کے انتظار میں خاموش رہے۔ درحقیقت میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنی بات کا آغاز کہاں سے کروں۔

''بابا رب نواز تو یاد ہوں گے بڑے ابا آپ کو۔'' میں فقط اتنا کہہ کر پھر سے خاموش ہو چکا تھا اور بڑے ابا میری یہ بات سنتے ہی فوراً اٹھ بیٹھے۔ وہ چادر کو اپنے کاندھوں کے گرد اوڑھتے ہوئے بولے۔

''ایسی برگزیدہ ہستی کو بھلا کون بھلا سکتا ہے۔ دنیا ہر در سے مایوس ہو کر جب ان کے در پر پہنچتی ہے وہی تو پھر امید کی کرن دکھاتے ہیں۔ ایک نظر کا کرشمہ ہم نے وہیں پہنچ کر دیکھا تھا۔ ایسے اللہ کے نیک برگزیدہ بندے بھی اللہ ہی کے کرم سے ملتے ہیں۔ شاید میاں تمہارا اپنا ہی کوئی نیک عمل تھا جو ہمیں اللہ نے بابا رب نواز سے ملوا دیا۔ تمہیں چارپائی پر ڈال کر ہر طرف سے مایوس ہو کر ان تک جو لے گئے تو نہیں جانتے تھے کہ یہ کرشمہ بھی ہو جائے گا اور آج دیکھو تو ہی پہلے سے طٰہٰ عالم میاں ہمیں اللہ نے لوٹا دیئے۔ بڑے ابا بابا رب نواز کی عقیدت میں سرشار جیسے بھیگ رہے تھے اور میری حالت' ان کی یہ بات سن کر کہ پہلے سے طٰہٰ عالم میاں' ہمیں اللہ نے لوٹا دیئے بے قرار ہو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ پہلے سے طٰہٰ عالم میاں نہیں بڑے ابا بلکہ بابا رب نواز کی دعا سے ملنے والے طٰہٰ عالم میاں۔'' طٰہٰ میاں آج عرصے بعد اچانک سے بابا جی کیسے یاد آ گئے؟'' مجھے چپ پا کر بڑے ابا نے سوال پوچھا تو میں جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''آپ کو یاد ہو گا بڑے ابا کہ بابا جی نے بڑی محبت سے اپنی ایک نشانی مجھے سونپی تھی اور پھر کہا تھا کہ جب اچھے ہو جاؤ تو اسے لوٹانے کے بہانے ہی اپنی شکل دکھا جانا۔''

''اور مجھے یاد ہے میاں کہ تم کوئی نشانی لئے بغیر وہاں سے پلٹنے والے کب تھے۔ وہی ان کے پیروں میں پڑے رہتے اگر بابا رب نواز تمہیں اپنی چادر نشانی کے طور پر رکھنے کو نہ دیتے۔'' بڑے ابا نے میری بات ختم ہوتے ہی جو بات کا آغاز کیا تو گویا میری ہی بات کو جیسے فصاحت سے بیان کر دیا تھا' پھر اس سے پہلے کہ میں انہیں چلنے کے لیے اصرار کرتا انہوں نے خود ہی اپنی خواہش کا اظہار کر ڈالا۔

''میاں میرا بھی بڑا دل چاہ رہا تھا ان سے ملاقات کو۔'' ان کے منہ سے اتنا سننے کی دیر تھی کہ میں بھی جھٹ سے بولا۔

''پھر بڑے ابا انتظار کس بات کا ہے۔'' میری یہ بات سنتے ہی بڑے ابا سرعت سے بولے۔

''میاں اٹھو ابھی جاؤ مائیکل کو گاڑی تیار کرنے کو بولو' ہم ناشتہ بھی راستے میں ہی کریں گے۔''

''یہ ہوئی ناں بات بڑے ابا۔'' میں نے ان کی بات سن کر خوشی سے کہا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے میری پیشانی پر پیار کیا اور میرے کاندھے کو تھپکایا۔ پھر بڑے ابا چلنے کی تیاری میں لگ گئے اور میں نے کمرے سے نکل کر خوشی خوشی مائیکل کو بابا رب نواز کی طرف چلنے کی خبر دی تو وہ بھی خوشی سے جیسے کھل اٹھا اور کاندھے پر رکھے رومال سے جھٹ سے گاڑی

صاف کرنے لگا۔

مائیکل کو گاڑی صاف کرتے دیکھ کر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھا' مجھے بھی لباس تبدیل کرنا تھا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں کمرے سے نکلنے لگا تو مجھے یاد آیا میں کچھ بھول رہا تھا۔ میں پلٹا مجھے یاد آ گیا کہ میں نے بابا جی کے لیے کافی سارے عطر خرید رکھے تھے' جو مجھے انہیں تحفتاً دینا تھے۔ الماری میں رکھے ایک بقچہ میں سارے عطر اچھے سے رکھ کر میں بقچہ اٹھا کر باہر آ گیا۔ باہر پہنچ کر میں نے دیکھا بڑے ابا اور مائیکل میرے ہی انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم سبھی کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔ یہ اللہ والوں سے ملنے کی خوشی تھی۔ ان سے ملنے کی خواہش ہی ہمیں یوں خوشی سے سرشار کیے جا رہی تھی۔

میں اور بڑے ابا گاڑی میں سوار ہوئے تو مائیکل نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ بڑے ابا نے ہاتھ میں تسبیح لیے اللہ کا ذکر کرنا شروع کر دیا تھا اور میں ابھی سے جیسے مسجد سے ملحقہ اس صحن میں جا پہنچا تھا جہاں بابا رب نواز اپنے ننھے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے اور ساتھ ہی میرے کانوں سے وہ آوازیں ٹکرانے لگی تھیں۔

''ایک ڈیوڑھا..... ڈیوڑھا''

''دو ڈیوڑھا..... تین''

تین ڈیوڑھا..... چار ڈیوڑھا''

''چار ڈیوڑھا.....؟''

میں اس گھڑی بابا رب نواز کے قریب فرش پر ہی بیٹھا تھا۔ جب وہ سامنے قطار میں بیٹھے اپنے کسی ایک شاگرد کو کھڑے ہو کر ڈیوڑھا کا پہاڑا پڑھنے کو کہہ رہے تھے۔

''ایک ڈیوڑھا..... ڈیوڑھا''

دو ڈیوڑھا..... تین''

''تین ڈیوڑھا.....؟''

جونہی وہ شاگرد رک کر سوچنے لگا' بابا جی نے اسے جا کر بیٹھنے کو کہا اور بابا جی کا اشارہ پاتے ہی اب ایک اور شاگرد بچوں کے سامنے کھڑے ہو کر ڈیوڑھا کا پہاڑا سنانے لگا۔

ایک ڈیوڑھا..... ڈیوڑھا

دو ڈیوڑھا..... تین

تین ڈیوڑھا..... چار ڈیوڑھا

چار ڈیوڑھا..... چھ

پانچ ڈیوڑھا..... سات ڈیوڑھا

سات ڈیوڑھا.....؟

وہ شاگرد بھی جب سات ڈیوڑھا پر رک کر حساب لگانے لگا تو اس کے عقب میں بیٹھے چند شریر قسم کے بچوں کی ہنسی چھوٹ گئی اور میں سوچنے لگا یا رب یہ کیا ماجرا ہے؟ ایک ڈیوڑھا..... ڈیوڑھا' دو ڈیوڑھا..... تین' میں حیرت زدہ سا بیٹھا پھر سے متوجہ ہو کر بابا جی اور ان کے شاگردوں کے درمیان چل رہا تعلیم کا یہ دلچسپ سلسلہ دیکھنے لگا' لیکن اب کی بار بابا جی نے کسی بھی شاگرد کو کھڑا ہو کر ڈیوڑھا کا پہاڑا پڑھنے کا اشارہ نہ کیا۔ چند لمحے خاموش رہ کر وہ اپنے شاگردوں سے مخاطب ہوئے۔

''میرے بچوں! ڈیوڑھا کا پہاڑا تو تم لوگ سیکھ ہی جاؤ گے پھر اسے رٹا لگا کر یوں فر فر سے پڑھنے بھی لگو گے۔ آپ کے چند ساتھی ایسے بھی ہیں جنہیں اگر میں کہوں تو وہ ابھی سارا پہاڑا سنا دیں لیکن جو اصل بھید تھا اس پہاڑے کے پیچھے وہ کچھ اور تھا۔

آپ اس پہاڑے کو پڑھنے میں ذہن سے کتنا سوچتے ہیں۔ اس قدر محو ہو کر آپ ایک مقدار کو دوسری مقدار میں جمع کرتے ہوئے آگے بڑھتے

ہیں اور اسی پل وقت کے کسی لمحہ میں آپ اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ آپ کو یہ دھیان ہی کب رہتا ہے کہ آپ کے عقب میں آپ کے اپنے ہی ساتھی آپ پر ہنس رہے ہیں۔ اسی پل میں اس برگد کے پھیلے بڑے سے پیڑ پر دیکھو تو کتنے ہی پرندے چہچہا رہے تھے لیکن آپ فقط ڈیوڑھا کے پہاڑے میں مگن ایک مقدار کو دوسری مقدار میں جمع کرنے میں لگے تھے۔ پھر ہماری نمازوں سے تو یہ ڈیوڑھا کا پہاڑا اچھا۔ ہم نماز میں کھڑے اپنے رب سوہنے کی حمد وثناء بیان کر رہے ہوتے ہیں تو ساتھ ہی ہمارے ذہن میں دنیا جہان کا حساب کتاب چل رہا ہوتا ہے' کوئی خیال یہاں سے آ رہا ہے' کوئی خیال وہاں سے آ رہا ہے' اور نماز فقط اٹھک بیٹھک کی مشق بن کر رہ جاتی ہے۔ نماز میں حضوری نہ ہو تو وہ نماز نہیں رہتی اور حضوری پیدا ہوتی ہے توجہ سے' خشوع وخضوع سے۔ ایک ایک آیت کو سمجھ سمجھ کر پڑھنے سے' جیسے آپ بچوں میں سے چند بچوں نے ابھی ڈیوڑھا کے پہاڑے کی مشق کی۔ اب نماز ادا کرنے جائیں تو اس بات کو ذہن میں رکھیے گا۔'' سبھی بچے تو انہماک سے باباجی کی نادر باتیں سن ہی رہے تھے مجھے میرے سوال کا جواب بنا پوچھے ہی مل چکا تھا۔ باباجی نے مسکرا کر میری جانب دیکھا تو مجھے لگا جیسے وہ کہہ رہے ہوں میاں پھر کب سنا رہے ہو بنا رکے ڈیوڑھا کا پہاڑا۔

مجھے چپ چاپ خیالوں میں گم پاکر پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''طہٰ میاں ہم لوگوں نے اپنے لیے کئی مرکز منتخب کر رکھے ہیں اور ہم انہی کے گرد گھومتے چلے جا رہے ہیں۔ جیسے مال' اولاد' حسن' شباب' عزت' شہرت' دفعتاً میں اپنی نشست سے یوں اچھلا اور بوکھلا کر میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی تب مجھے ہوش آیا کہ میں کہیں بہت دور نکل چکا تھا۔ مائیکل کو بے دھیانی میں کہیں روڈ بریکر دکھائی نہ پڑا تھا' اور گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ ہوا میں تیرنے لگی تھی' مائیکل نے گاڑی کی رفتار کم کرنے کے بعد ایک بار پھر سے اپنی رفتار سے آگے بڑھا دی تھی۔ ہمارا اب تقریباً نصف سے زیادہ کا سفر طے ہو چکا تھا۔ جب ایک بارونق بازار میں سے گزرتے ہوئے بڑے ابا کہنے لگے کہ ہمیں یہیں رک کر ناشتہ کر لینا چاہیے۔ تب مائیکل نے بڑے ابا کی بات سنتے ہی ایک ریستوران کے پاس گاڑی روک دی تھی۔

ناشتہ کرنے کے بعد تازہ دم ہو کر ہم لوگ پھر سے اپنے سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ بڑے ابا پھر سے ہاتھ میں تسبیح تھامے سیٹ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے ذکر میں مصروف ہو چکے تھے اور میں ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہا تھا۔ سمندر کی بیقرار موجوں کی طرح انسان دکھائی پڑ رہے تھے۔

''ہم لوگوں نے اپنے لیے کئی مرکز منتخب کر رکھے ہیں' اصل مرکز کو چھوڑ کر ہم فقط انہی کے گرد گھومتے چلے جا رہے ہیں۔'' مجھے بابا رب نواز کے کہے یہ الفاظ یاد آ رہے تھے۔ سچ ہی تو کہا تھا بابا رب نواز نے ہم اصل کو چھوڑ کر لاحاصل کے پیچھے بھاگیں گے تو حاصل فقط پچھتاوا ہی رہ جائے گا۔ جیسے آج پچھتاوا میرا مقدر بن چکا تھا لیکن کسی فورس آف اٹریکشن نے مجھے اپنے مدار سے بالکل خارج نہیں ہونے دیا تھا۔ وقتی طور پر میری رفتار سست کر دی تھی۔ میرے ضمیر کو مردہ ہونے سے پہلے ہی جگا دیا تھا اور یہ سیلف ایکسائیٹڈ کا کام میرے احساس ندامت نے کیا تھا۔

ایسا ہی سوچتے ہوئے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ اب ہم اپنی منزل

مقصود تک پہنچنے ہی والے تھے۔ مائیکل نے مسجد کے قریب پہنچ کر گاڑی روک دی اور ساتھ ہی گاڑی کا انجن بھی بند کر دیا تھا۔ میں اور بڑے ابا گاڑی سے اترے آج دھوپ خاصی چمکیلی اور تیز تھی لیکن جنوری کی سرد ہوا میں دھوپ کی کیا چلتی۔ میں اور بڑے ابا آگے بڑھے مائیکل بھی ہمارے ساتھ پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جب مجھے یاد آیا کہ اصل چیز تو ہم گاڑی میں ہی بھول آئے تھے۔ وہ بقچہ جس میں عطر رکھے تھے اور ایک چادر یہ دونوں چیزیں میں نے مائیکل کو گاڑی سے لانے کے لیے واپس بھیج دیا تھا اور خود بڑے ابا کے ہمراہ میں اس اونچی مسجد کی سیڑھیاں چڑھنے لگا جو اس شہر کی خاصی پرانی جامع مسجد تھی۔ شہر کے بیچ و بیچ ہونے کے باوجود مسجد کے اطراف میں کچھ اس قدر پیڑ پودے موجود تھے کہ یہ جگہ کچھ الگ تھلگ سی ہی دکھائی پڑتی تھی۔

مسجد کے وسیع صحن میں اترتے ہی میری ناک کے نتھنوں سے وہی لاہوتی سی مسحور کن خوشبو ٹکرائی اور میرا ذہن جیسے اس جہاں کی ہر چیز سے بے نیاز کسی اور جہاں کی سیر کو نکل گیا تھا۔ جب مجھے بڑے ابا نے ٹوکا' میاں وہاں کہاں جا رہے ہو' راستہ اس طرف ہے۔ مسجد کی عمارت کے بائیں طرف ہی وہ راستہ تھا جو مسجد کے عقب میں جا نکلتا تھا۔ ہم اس راستے سے ہوتے ہوئے اس دوسرے صحن میں جا اترے جو پہلے صحن سے ذرا چھوٹا تھا' لیکن ایک اور فرق بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ ابتدائی حصے میں فقط نماز کے اوقات میں ہی رونق دکھائی پڑتی تھی لیکن عقبی جانب مسجد کے اس حصے میں جہاں بابا رب نواز رونق افروز تھے دن رات لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اس صحن کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا' ایک جانب بچے تعلیم کے لیے بیٹھتے تھے جبکہ دوسرے حصے میں وہ مصیبت زدہ لوگ بیٹھا کرتے تھے جو نہ جانے کتنے ہی میلوں کا سفر طے کر کے بابا جی سے ملاقات کو آتے تھے اور پھر اپنی باری آنے کے انتظار میں وہ یہیں اس حصے میں ڈیرہ جما لیتے تھے۔ بڑے ابا کو میں نے ذرا دیر کو اسی جگہ رکنے کو کہا میں چاہتا تھا کہ مائیکل گاڑی میں سے سامان لے کر آ جائے تو ہم اندر چلیں لیکن پھر نہ جانے کس سمت سے ایک ننھے سے بچے نے آ کر میرے ہاتھ کو جھنجوڑا' میں نے جو سر کو گھما کر اس کی جانب دیکھا تو وہ جھٹ سے بولا۔

''بابا جی آپ کو اس طرف یاد فرما رہے ہیں۔'' یہ سن کر میں نے مسکرا کر اس بچے کے گال کو تھپکایا تو وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پھر سے کسی سمت کو غائب ہو گیا تھا۔

''لو میاں بابا جی کو ہمارے آنے کی خبر ہو گئی۔'' بڑے ابا نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا اور ہم جو پہلے سے ہی شوق دیدار کو بے قرار تھے' اب ہماری بے تابی اور بڑھ گئی تھی۔ ہم بھی کچھ بھلا کر آگے بڑھے اور اس نشیبی کمرے کی سیڑھیاں اترنے لگے جو پہلے صحن سے ذرا گہرائی میں تھا۔ آخری سیڑھی سے نیچے قدم رکھنے سے پہلے ہی میری نظر مجمعے میں بیٹھے بابا رب نواز پر پڑی۔ ایک سیکنڈ کے کسی ہزارویں حصے میں مجھے لگا سینکڑوں طرح کی روشنیاں میری قوت بصارت سے ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے میں ہوش و حواس سے بیگانہ فرش پر جا گرا۔

بابا جی کی سحر بھری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی نہ جانے میں کتنی دیر تک بے ہوشی میں رہا تھا۔ بابا جی کی آواز سن کر میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ ''ایک تو بھلے آئے ہو میاں اور دوسرا تم اس عمر میں اپنے بڑے ابا کو بڑا پریشان کیے ہوئے ہو۔''

بابا رب نواز کی یہ بات سن کر میں نے سر کو جو گھما کر دیکھا تو بڑے ابا مجھے واقعی مضطرب دکھائی پڑے۔ یہ دیکھ کر میں فوراً ہی اٹھ بیٹھا اور بابا رب نواز کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ اس وقت چند اور بھی عقیدت مند بابا جی کے گرد موجود تھے۔ جب چند لمحوں کی خاموشی پاتے ہی میں نے اپنے دل میں اٹھتے سوال کو بابا جی کے سامنے کہہ ہی ڈالا۔

''آخر کو ایسا کیا ہوا جو میں یوں اپنے ہوش وحواس سے ہی بیگانہ ہوگیا تھا؟'' میرا سوال سن کر بابا جی مسکرائے اور بولے۔ ''کچھ ایسے انسان بھی ہوتے ہیں جن کہ نامہ اعمال میں کوئی طویل ریاضتیں شامل نہیں ہوتیں چاروں طرف سے دنیاداری کے گورکھ دھندوں اور شیطانی پانسوں میں پھنسے کسی روز جو رب تعالیٰ کی طرف سے آئی کسی آزمائش پر پورے اترتے چلے جاتے ہیں' صبر' ہمت' حوصلہ اور سب سے بڑی بات جو تقویٰ رکھتے ہیں پھر وہ بارگاہ خداوندی میں ان اللہ والوں سا مقام پالیتے ہیں جنہوں نے ساری زندگی عبادتوں ریاضتوں میں بیتائی ہوتی ہے۔'' بابا جی پھر فقط اتنا ہی بول کر خاموش ہوگئے تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ میرے سوال کا جواب تو نہ تھا' شاید میں اپنی ناقص عقل وفہم سے بابا جی کی یہ پیچیدہ باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ یونہی بابا جی کے پاس بیٹھے ہوئے ایک دم سے میرے ذہن میں خیال آیا کہ مائیکل ابھی تک گاڑی میں رکھی چیزیں لے کر نہیں پہنچا تھا حالانکہ ہمیں بابا جی کے پاس بیٹھے کافی وقت بیت چکا تھا۔ پھر میری بے چینی کو جیسے بابا جی نے بھانپ لیا تھا۔ میں ان سے اجازت لے کر اٹھا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے مائیکل اس کمرے سے باہر ہی موجود ہو اور کمرے میں داخل ہونے سے ہچکچا رہا ہو لیکن باہر صحن میں پہنچنے پر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا' یونہی دائیں بائیں دیکھتے ہوئے میں مسجد کے بیرونی دروازے تک جا پہنچا اور بیرونی دروازے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے جو میری نظر مائیکل پر پڑی تو وہ وہیں مسجد سے باہر سیڑھیوں کے پاس سامان لئے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جلدی سے میری جانب بڑھا۔

''مائیکل تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو' میں اور بڑے ابا کب سے تمہارا انتظار کررہے تھے۔'' میری بات سن کر مائیکل معذرت خواہ انداز میں ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''صاحب میں مسجد...... میں............ میں نے سوچا آپ کہیں ......'' وہ جھجکتے ہوئے کھل کر بات نہیں کر پارہا تھا لیکن میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔

''مائیکل یہ اللہ میاں کا گھر ہے جس کے دروازے تو ہر کسی کے لیے کھلے ہیں تمہیں اندر آجانا چاہیے تھا۔ چلو اب آؤ میرے ساتھ۔'' وہ ابھی بھی ہچکچا رہا تھا اور مجھے سامان وہیں سے پکڑا دینا چاہتا تھا لیکن اب میں اسے خود اندر لے جانا چاہتا تھا اور اسے ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ مائیکل تو مسیحی تھا۔ ہمارے ہاں تو فرقے واریت کی کچھ ایسی فضا قائم ہوچکی ہے کہ کسی ایک فرقے کے مسلمان کسی دوسرے فرقے کی مسجد میں جاکر نماز پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ مجھے افسوس ہورہا تھا کہ آج ہم کس قدر بٹ چکے ہیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کے صحن میں پہنچے تو ایک جانب لوگوں کو وضو کرتا دیکھ کر مائیکل رک گیا۔

''صاحب اللہ میاں کے گھر آ ہی گیا ہوں تو منہ

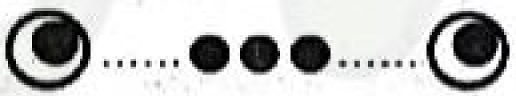
ہاتھ دھولوں۔" مائیکل کی بات سن کر میں مسکرایا اللہ میاں کے گھر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کے ذہن میں طہارت کا خیال ہی پیدا ہوا تھا پھر مائیکل وضو خانہ کی جانب بڑھ گیا تھا اور میں ایک بغچہ جس میں وہ عطر تھے جو میں باباجی کو تحفتاً دینے کے لیے لایا تھا اور ایک چادر جو ان کی امانت تھی اور خصوصاً جو میں انہیں شکریہ کے ساتھ لوٹانے آیا تھا۔ یہ سامان لے کر میں مسجد کے عقبی حصے کی جانب بڑھا پھر عقبی حصے کی سیڑھیاں اتر کر میں باباجی اور بڑے ابا کے پاس پہنچا اور پھر سے سلام کرنے کے بعد باباجی کے پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔

باباجی بڑے ابا سے گفتگو میں محو تھے۔ جب ان کا سلسلہ کلام ختم ہوا تو میں نے نہایت محبت سے انہیں عطر سے بھرا بغچہ تحفتاً پیش کیا جسے انہوں نے خوش دلی سے قبول فرمالیا۔ میں نے پھر ان کی دی چادر ان کی جانب بڑھائی جسے دیکھ کر وہ مسکرادیئے کچھ دیر ایسے ہی چادر کو دیکھتے رہے اور پھر بولے۔

"طٰہٰ میاں چادر تو ہمیں لوٹانے آہی گئے' اب کی بار ہمارے پاس ہی ٹھہر جاؤ۔" باباجی کی بات سنتے ہی جیسے میں بھونچکا سا ہو کر رہ گیا تھا۔ یارب میں اس قابل کہاں' مجھے جیسے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ باباجی مجھے اپنے ساتھ اللہ کی راہ میں لے جانا چاہتے تھے۔ وہ میرا بخت چمکانا چاہتے تھے اور میں اپنے ہی آپ میں پہیلی بنا تغافل میں پڑا رہا' وہ مجھے کہتے رہے اور میں فقط سنتا رہا۔

"کہاں تک بھاگو گے میاں کسی نہ کسی روز تو ہمارے ساتھ چلنا ہی ہے تمہیں۔" ان کی یہ بات سن کر میں نے بڑے ابا کی جانب دیکھا۔ مجھے لگا جیسے وہ بھی تیار بیٹھے تھے اٹھنے کے لیے' میں نے سر گھما کر باباجی کی جانب دیکھا اب کی بار وہ مسکرادیئے' انہوں نے اپنا ایک ہاتھ میرے دائیں کاندھے پر رکھا اور نہایت شفقت سے بولے۔

"جیسی تمہاری مرضی میاں یہاں زور زبردستی نہیں چلتی۔" وہ میری حالت کو بھانپ گئے تھے۔ بڑے ابا نے باباجی سے اجازت طلب کی اور میں جیسے بھاری ہوتے قدموں کے ساتھ ان کے ہمراہ چل دیا۔ جیسے میرے وجود میں کوئی گھمسان کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ دونوں طرف کی فوجیں توپیں گاڑھے ایک دوسرے پر گولے برسا رہی تھیں اور دونوں ہی قوتیں ہم پلہ تھیں فقط کمزور تھا تو میرا وجود جسے میں گھسیٹتا ہوا بڑے ابا کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا' شاید ابھی آزمائش طویل تھی یا میں خود ہی اپنے آپ کو آزمائشوں میں ڈالنے کے لیے آمادہ ہو چکا تھا۔



بابا رب نواز کی طرف سے ہو کر آنے کے کئی دن بعد تک بھی میں مضطرب سا جیسے کسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ہر گھڑی یہی سوچتا رہا کہ آخر وا ایسا کیا بچا تھا اب میری زندگی میں جس کی خاطر میں نے باباجی کی بات سنی ان سنی کر دی۔ اور بڑے ابا کے ساتھ پھر سے گھر چلا آیا۔ بہت سوچتا رہا لیکن مجھے اس سوال کا جواب نہ ملا۔ اب میرے پاس باباجی کی نشانی وہ کالی چادر بھی نہ تھی جس سے اٹھنے والی سحر زدہ سی خوشبو مجھے غموں سے وقتی نجات دلا کر راحت اور سکون کی ایسی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتی تھی جہاں میں غوطہ زن نہ جانے کس جہاں جا نکلتا تھا۔

اگلے پل ہی میں نے ارادہ کر لیا کہ میں پہلی فرصت میں ہی بازار جا کر ویسی ہی کالی چادر خرید لاؤں گا' اب مجھے چادر اوڑھنے کی عادت ہو چکی تھی اور پھر شام کو بازار جا کر میں ایک کالی چادر لے ہی

آیا۔ اسے اپنی پسند کا عطر لگایا لیکن نہ جانے کیوں پھر بھی وہ مجھے پسند نہ آئی اور میں سوچنے لگا کہ بابا جی نے اپنی چادر مجھے ہمیشہ کے لیے کیوں نہ دے دی۔ نہ جانے اس میں بھی کیا بھید چھپا تھا اپنے کمرے میں بیٹھا اس وقت میں یہی کچھ سوچ رہا تھا جب بابا عبدالقادر میرے کمرے میں آئے وہ بڑے ابا کا پیغام لے کر آئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یومنہ کو اسٹیشن تک چھوڑ آنے کے لیے میں جاؤں۔ وہ بڑے ابا کا یہ پیغام دے کر چلے گئے تو ان کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی میں اپنے کمرے سے نکل کر پورچ کی جانب بڑھا تو وہاں پہنچ کر یومنہ کو دیکھتے ہی مجھے یاد آیا میں نے اسے چند روز پہلے ایک عبایا تحفتاً دیا تھا لیکن اب اسے عبایا کے بغیر دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ میں فقط اتنا ہی کر سکتا تھا' وہ اب سبھی سے الوداعی ملاقات کر رہی تھی۔ جب بابا عبدالقادر اس کا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھ رہے تھے۔ وہ سامان گاڑی میں رکھ چکے تو میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور یومنہ کے میرے مد مقابل سیٹ پر بیٹھتے ہی میں نے گاڑی دھیرے سے آگے بڑھا دی تھی' راستہ بھر یومنہ کو چپ چاپ دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ میں نے اسے عبایا فقط اس لیے لے کر دیا تھا کیونکہ ایسا کرنے کو میرا من چاہا تھا' میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسے وہی عزت دوں جس عزت کی وہ عورت ہونے کی وجہ سے حقدار تھی' میں جو اس کے ساتھ ایک غیر محرم تھا' اگر کبھی انجانے میں ساتھ چلتے ہوئے اس کی جانب نگاہ اٹھ جائے تو میری نگاہ اس کے وجود تک نہ پہنچ پائے اور میں ہی کیا اس کے اردگرد موجود کوئی بھی شخص اس کی جانب دیکھے تو اس کی نگاہ خود ہی پلٹ جائے کہ یہ ایک باحیا باوقار مسلم عورت ہے۔

معمولی علیک سلیک کے بعد راستہ بھر ہم دونوں خاموش ہی رہے اسٹیشن پہنچ کر جو میں نے معلومات حاصل کیں تو ٹرین کی روانگی ابھی پونے دو گھنٹے تاخیر سے ہونا تھی۔ ہم لوگ کافی پہلے اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ میں جو یہ معلومات لے کر واپس گاڑی کے پاس پہنچا تو یومنہ گاڑی سے نکل کر پلیٹ فارم پر موجود بھیڑ میں میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ قریب پہنچ کر میں نے اسے بتایا کہ ابھی ٹرین کی روانگی میں پونے دو گھنٹے پڑے ہیں۔ جسے سن کر وہ کچھ سوچنے لگی تھی اور میں قریب کھڑا سمجھ گیا تھا کہ میری بات سن کر وہ شش و پنج میں پڑی یہی سوچ رہی ہو گی کہ اب اتنا وقت جو وہ مجھے پہلے ہی اسٹیشن لے آئی تھی' تو مجھے اس کے ہمراہ خواہ مخواہ میں ہی انتظار کرنا پڑے گا۔ اسے تا حال خاموش دیکھ کر میں خود ہی بول پڑا کہ میں اسے گاڑی میں بٹھا کر گاڑی روانہ ہونے تک یہاں سے کہیں نہیں جانے والا' میری یہ بات سن کر جیسے وہ کچھ اچھا محسوس کرنے لگی تھی پھر ہم دونوں ہی پلیٹ فارم پر انتظار کرنے والوں کے لیے لگے بینچ کی جانب بڑھے اور پھر جس بینچ پر ہم بیٹھے تھے وہاں پہلے سے ہی ایک معمر شخص بیٹھا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ بینچ پر پانچ' چھ لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اب ہم تینوں ہی یوں بیٹھے تھے جیسے امتحان کے وقت استاد بچوں کے درمیان فاصلہ چھوڑ کر بٹھاتے ہیں۔ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ میں سامان کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کرتے قلی بھی میری توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے اور میرے ساتھ بیٹھی یومنہ بھی شاید اسی بھیڑ کا مشاہدہ کر رہی تھی جب پھر کسی جانب سے ایک عبایا پہنے ہوئے لڑکی ہمارے پاس آئی' اور وہ معمر شخص جو ہمارے قریب چپ چاپ بیٹھا تھا' وہ اس کا ایک ہاتھ تھامے اسے اپنے ساتھ لے گئی اور میں انہیں دور تک جاتا دیکھتا رہا۔ جب یومنہ کی آواز میرے

کانوں سے ٹکرائی۔

"طٰہٰ آپ یہی سوچ رہے ہوں گے ناں کہ میں نے آپ کا تحفتاً دیا عبایا نہیں پہنا۔" میں اس کی بات پر جس قدر حیران ہو کر اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ اب اسی قدر متجسس ہو کر اس کی اگلی بات سن رہا تھا۔

"دراصل میں اب تک زندگی کو جیسے جیتی آئی ہوں' میں نے کبھی ایسے کچھ سوچا ہی نہیں' زندگی میں ٹھہر نے کا ایسا سوچنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور میں دعا کرنے لگا کہ یومنہ اللہ آپ کو کبھی کسی آزمائش میں نہ ڈالے کہ آپ کو زندگی میں ٹھہر جانا پڑے' وہ رب العزت آپ کو سبھی کچھ عطا کردے بن مانگے۔" میں اس کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا اور وہ پھر سے مجھ سے مخاطب تھی۔

"طٰہٰ میں آپ سے جاننا چاہتی ہوں کہ ایسا آپ کی زندگی میں کیا ہوا تھا؟ جس نے آپ کی زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ آپ ہمیشہ سے تو ایسے نہ تھے' آپ سے کوئی شخص بھی ایک بار مل لینے کے بعد یہ ضرور سوچے گا کہ آپ بہت الگ ہیں۔" یومنہ بولتی رہی اور اس کی باتیں سن کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اردگرد کوئی تیز آندھی چلنے لگی تھی۔ جس میں اڑ رہے اوراق میرے ماضی کے مختلف ادوار تھے اور پھر میرے لب ہلنے لگے جن سے نکلتی مدھم آواز کو سننے کے لیے یومنہ مجھ سے ذرا اور قریب آ چکی تھی۔

مجھے یاد آ رہا تھا کہ اس روز خوب بارش ہو رہی تھی۔ ایسی موسلا دھار بارش کہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی اور کہنے والے کہہ رہے تھے کہ ہمارے خاندان کی ہر شادی پر موسم ایسا ہی ہو جاتا تھا۔ غلام مصطفیٰ عالم کی شادی ہونے جا رہی تھی۔ عبیرہ کی سالگرہ پر ماں اور ابا کی ملاقات ایک ایسے خاندان سے ہوئی تھی جو انہیں ہر لحاظ سے اپنے شایان شان لگا تھا۔ لڑکی کسی غیر ملکی یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹی تھی اور ماں کو ایسی ہی بہو کی تلاش تھی جو انگریزی خوب جانتی ہو اور جب وہ اپنی ہم عصر خواتین سے اسے ملائیں تو وہ اپنی انگریزی سے انہیں خوب مرعوب کر سکیں۔

ہم لوگ جو بے موقع اپنے لیے جشن کا سامان ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔ اب ایسے ہی موقعوں پر ایسی ہی راتوں میں تو ہمارے خزانوں کے بند منہ کھلتے تھے۔ پیٹیاں بھر بھر کے پیسہ صرف آج کی رات رقص پیش کرنے والیوں پر نچھاور کرنے کو لایا گیا تھا۔ آتش بازی' دیسی ولایتی سبھی کے لیے سبھی قسم کے انتظامات پورے تھے۔

لیکن ان سبھی قسم کی فضولیات سے اگر کوئی واحد نہ خوش تھا تو وہ فقط بڑے ابا تھے۔ وہ میرے ابا کو بلا کر ایک طرف لے گئے اور انہیں سمجھانے لگے کہ یہ سبھی قسم کی بیہودگی ہمارے رسم و رواج نہیں' لیکن ابا کہاں ان کی بات سننے والے تھے۔ الٹا انہیں سمجھانے لگے کہ اب ان کا زمانہ نہیں رہا۔ عین اسی وقت رقص و سرور کی محفل اپنے عروج پر تھی۔ میں نے جو مست ہو کر کسی رقص پیش کرنے والی کا بازو تھاما تو دوسرے ہاتھ سے نوٹوں کی ایک گڈی ہوا میں اچھال دی۔ روپوں کی برسات ہونے لگی تھی۔ ایک برسات باہر تھمنے کا نام نہ لے رہی تھی تو دوسری برسات ہم لوگوں نے روپوں کی کر رکھی تھی۔ دفعتاً میری نظر ایک طرف کھڑے بڑے ابا پر پڑی وہ میرے ابا کو ابھی تک مسلسل سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ انہیں یہ فضولیات بالکل پسند نہ تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ خورشید عالم میرے ابا یہ سب ناچ گانا بند کروا دیں۔

میں ایسے ہی مست ماحول میں جھومتا وہاں پہنچا اور بڑے ابا جو برابر میرے ابا کو سمجھانے کی کوشش

کررہے تھے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ میں کب وہاں پہنچا اور پھر میں نے جو انہیں عقب سے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا تو اب وہ چھڑانے کی کوشش میں مجھے سنانے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر پاس کھڑے میرے ابا زوردار قہقہے لگانے لگے تھے پھر میں بڑے ابا کو اپنی بانہوں کے حصار سے آزاد کرکے اب انہیں اپنے ساتھ جھومنے گانے کی دعوت دے رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ بھی اپنے بڑے پوتے کی شادی پر کس قدر خوش تھے' ان کا سارا غصہ' ساری خفگی ظاہراً ہی تھی لیکن پھر وہ مجھے بھی سمجھانے لگے تو میں انہیں اپنے ساتھ لے جا کر گھر کے اس خاص حصے میں چھوڑ آیا جہاں انہی کی ٹائپ کے سنجیدہ حضرات بیٹھے ہم آج کی نسلوں پر گفتگو فرما رہے تھے۔ میں فوراً ہی وہاں سے پلٹا میرے سبھی دوست احباب اس طوفانی موسم کی پروا کیے بغیر پہنچ چکے تھے لیکن ان سبھی کے بیچ میں خود کو تنہا محسوس کررہا تھا' اس کی وجہ یہ تھی کہ عبیرہ ابھی تک نہ پہنچی تھی اور پھر مجھے کسی سے معلوم پڑا کہ داؤد بھی ابھی تک نہ پہنچا تھا۔ یہ جان کر مجھے کچھ عجیب بے چینی کا احساس ہونے لگا کچھ دیر پہلے ہی عبیرہ سے میری بات ہوئی تھی' اس کا کہنا تھا کہ بارش کے تھمتے ہی وہ چلی آئے گی اور جب میں نے اس سے داؤد کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا کہ وہ نہیں جانتی کہ داؤد ابھی تک کیوں نہیں پہنچا پھر میں نے جو داؤد کا نمبر لگایا تو وہ بھی مسلسل آف جارہا تھا۔ اب میں نے سبھی قسم کے غلط خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور پھر سوچا کہ بہت ہوگیا اب یہ سب میں عبیرہ کو خود لینے جاؤں گا' اور یہ سوچتے ہوئے میں گاڑی بھی اسٹارٹ کرچکا تھا اور گھر سے نکلنے ہی والا تھا جب عبیرہ کی کال آگئی۔ میں نے جھٹ کال ریسیو کی اور پھر ساتھ ہی میں نے گاڑی کا انجن بند کردیا۔ اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی اور وہ کہہ رہی تھی کہ وہ آج نہیں آپائے گی' یہ سنتے ہی میں گاڑی سے اترا تو ایک لات رکھ کے گاڑی کو رسید کی تو جیسے میں اس طرح سے اپنا غصہ قابو میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔ اب پھر سے غلط قسم کے وسوسے میرے ذہن میں یلغار مچانے لگے تھے۔ عین اسی لمحے اندر ہال میں گلوکارہ نے جو نیا شوخ سا گانا شروع کیا تو وہاں لگی بھیڑ کی اونچی سیٹیوں اور شور کی آوازیں باہر پورچ تک سنائی دے رہی تھیں۔ میں وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہال میں پہنچا اور پھر مست منچلوں کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں سے کیسے ایک بوتل میرے ہاتھ لگ گئی اور پھر میں نے اسے منہ سے لگالیا۔ ہوش میں تو میں پہلے ہی نہ تھا اور میرے ابا بھی نہ تھے' ورنہ بڑے ابا کو بھلا ہمیں یوں سمجھانے بجھانے کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ ہوش میں ہوتے تو کیا یوں لاکھوں روپیہ ناچنے والیوں پر نچھاور کرتے اگر حواس قائم ہوتے تو کیا گھر جیسے پاکیزہ ماحول میں ننگے سر اور بدن والی عورتوں کو نچاتے اور اب پی لینے کے بعد ہوش سے ہی نہیں ہوش وحواس سے بے گانہ ہوکر میں کبھی کسی رقاصہ کا بازو تھام لیتا تو کبھی کسی کے ہمراہ رقص کرنے لگتا تو کبھی مجھے اپنے ساتھ ناچ رہی رقاصہ عبیرہ دکھائی دینے لگتی اور میں یوں کھل اٹھتا جیسے عبیرہ آگئی ہو اسے یہ احساس ہوگیا کہ ظہٰ عالم اسے کتنا مس کررہا ہے اور وہ بھری برسات میں اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود میری خوشی کی خاطر چلی آئی ہو اور اب ناچ ناچ کر مجھ پر فدا ہوئی جارہی ہو نشے نے بری طرح سے مجھ سے میرے ہوش وحواس سلب کررکھے تھے۔

اب میں جو سامنے ناچ رہی رقاصہ کو عبیرہ سمجھ

رہا تھا تو اسی خوش فہمی میں لڑکھڑاتے ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ جھوم رہا تھا پھر جیسے ہی وہ میرے وجود سے آ لگی میں نے اس کا بازو تھام لیا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا' ہال سے نکلتے ہی کمروں کی لمبی قطار شروع ہو چکی تھی۔ یہ ہال اور ملحقہ کمرے ہمارے محل نما گھر کا مہمان خانہ تھا۔ میں اسے ساتھ لیے راہداری میں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا' ایک کمرے کے ہینڈل لاک کو گھمایا وہ بند تھا۔ میں اگلے کمرے کی جانب بڑھا ہینڈل گھمایا اور وہ یوں کھلا کہ میں گرتے گرتے سنبھلا۔ کسی عقبی روشندان سے کمرے میں روشنی آ رہی تھی اور ویسے بھی اب میں ہوش میں ہی کہاں تھا کہ لائٹ آن کرتا۔

صبح جو میری آنکھ کھلی تو بستر پر میں فقط تنہا ہی تھا۔ نشہ اتر چکا تھا' لیکن لباس پہنتے ہوئے میں یہی سوچ رہا تھا کہ عبیرہ اگر میرے ساتھ تھی تو پھر وہ ابھی کہاں ہے؟ لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا وہ رات ہماری طرف آئی ہی کب تھی' یہ بات مجھے گھر کے ملازم سے پتہ چلی تو اب میں اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔ رات بھر میرے ساتھ میرے بستر پر جو تھی وہ عبیرہ نہیں تھی۔ مجھے اپنے آپ پر ہی نہیں عبیرہ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے کئی روز تک میں نے اس سے بات کرنا ترک کر دیا تھا اور جب شادی کی سبھی رسومات اختتام پذیر ہو چکی تھیں' ایک روز داؤد اپنی جیپ پر میرے گھر آ پہنچا۔ عبیرہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ وہ میری عبیرہ کے ساتھ چل رہی ناراضگی کو لے کر ہمارے درمیان صلح کروانا چاہتا تھا۔ مجھے داؤد سے کسی بھلے کی امید تو نہ تھی لیکن آج جب وہ میرے اور عبیرہ کے درمیان صلح کروانے کی غرض سے آیا تھا تو مجھے وہ بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ میں جو ایک پل بھی عبیرہ کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا آج تین' چار روز سے میں نے اس سے بات تک نہ کی تھی' مجھے بھی بس ذرا بہانے کی تلاش تھی۔ داؤد جیسے پہلے سے ہی پروگرام بنا کر آیا تھا۔ ہم تینوں گھر سے نکلے راستے میں دو ایک اور دوستوں کو ساتھ لیا اور ہمارے فارم ہاؤس جا پہنچے۔

فارم ہاؤس پہنچتے ہی سبھی نے پول میں چھلانگیں لگا دیں اور میں عبیرہ کو لے کر ایک طرف کو چل پڑا۔ آج کتنے ہی دنوں بعد ہم ایک ساتھ تھے اور بالکل خاموشی سے ایک ساتھ چل رہے تھے۔

''عبیرہ''

''ہوں'' وہ میرے آواز دینے پر چونکی۔

''کیا سوچ رہی ہو تم عبیرہ؟'' اس کے یوں چونکنے پر میں نے سوال کیا۔

''نہیں تو...... کچھ بھی تو نہیں۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ فقط اتنا ہی جواب دے پائی تھی۔

''بھائی کی شادی تو اب ہو گئی' اب بچا ہوں میں تو کس روز لینے آؤں تمہیں بینڈ باجے کے ساتھ۔'' میں نے ایک دم سے رکتے ہوئے اس کے بالکل سامنے آ کر پوچھا۔ وہ میری بات سن کر نہ تو خوش ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی جواب دیا۔ وہ مجھے یونہی کھڑا چھوڑ کر ایک قدم آگے بڑھ گئی اور میں بھی پلٹ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم لوگ اب چلتے چلتے کافی آگے نکل چکے تھے۔ تب اس کی خاموشی اور بے اعتنائی پر مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا اور میں پھٹ پڑا۔ ''عبیرہ'' میں نے بلند آواز سے اسے پکارا۔ وہ ششدر سی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ جب میں نے اپنی بات مکمل کی ''تمہیں آخر ہوا کیا ہے؟''

''ظ یہ تم کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہے ہو۔'' میرے غصے سے چلانے پر اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

میں آگے بڑھا اور اپنے غصے پر قدرے قابو پاتے ہوئے میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی نگاہوں میں جھانکنے کی کوششیں کی۔

''عبیرہ میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ جب ہم دونوں ہی راضی ہیں تو پھر شادی میں دیر کیسی؟'' وہ میری بات سن کر مجھ سے نگاہیں چرا گئی اور مجھ سے قدرے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''طہٰ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو تمہیں وجہ بتانا پڑے گی عبیرہ۔''

''آخر کو کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ بولو......'' میں نے ایسا گرج دار آواز سے کہا اس پل مجھے نہ جانے کیا ہورہا تھا جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا یا زمین میرے پیروں تلے سے کھسکنے لگی تھی جب اس نے اپنا کھرا سا جواب بھی سنا دیا۔

''میں وجہ بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔'' وہ فقط اتنا کہہ کر واپسی کے لیے پلٹ گئی اور میں وہیں ساکت کھڑا حیرت زدہ سا اپنے ذہن میں اٹھ رہے اس سوال کا جواب کھوج رہا تھا کہ آخر کو وہ ایسا کیوں کررہی تھی؟ میرے ذہن میں اٹھ رہے اس سوال کا جواب بھی فقط وہی دے سکتی تھی جو یہ کہہ کر پلٹ گئی تھی کہ وہ جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔ میں کچھ دیر وہیں حیرت سے مجسمہ بنا کھڑا رہا اور پھر اسے کافی آگے نکلتا دیکھ کر میں بھی پیچھے چل پڑا۔

جب میں سبھی کے پاس پہنچا تو وہ اس وقت شرارتوں میں مگن تھے۔ میں چپ چاپ اس کے پاس سے گزر جانا چاہتا تھا جب داؤد نے مجھے آواز دی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ پول میں فٹ بال کھیلنے کی دعوت دے رہا تھا اور عبیرہ بھی پیروں کو پول میں لٹکائے وہیں کنارے پر بیٹھی تھی۔ میں داؤد کو کوئی بھی جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا تھا۔ جب کبھی میں بے حد پریشان یا مایوس ہونے لگتا تھا یہیں اسی فارم ہاؤس آ کر ولایتی کی جگہ برانڈی پیا کرتا تھا' پول کے پاس ہی فارم ہاؤس کے ریسٹ رومز تھے میں نے اندر پہنچ کر برانڈی کی ایک بوتل نکالی اور اسے گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔

''تمہیں وجہ بتانا پڑے گی......عبیرہ؟''

''آخر کو کیا وجہ ہے بولو......؟''

میرا ہر گھونٹ پھر سے اس سے وہی سوال دہرا رہا تھا اور اس کا بھی وہی کھرا سا جواب میرے ذہن میں کسی ہتھوڑے کی ضرب بن کے برس رہا تھا۔

''میں وجہ بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔'' میں اس کے اس کھرے سے جواب کے بدلے خود ہی وجہ کھوجنے لگا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ برانڈی کا تیز نشہ میرے اعصاب پر چڑھنے لگا تھا لیکن میں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پایا کہ اس کے ایسے رویے کی کیا وجہ ہوسکتی تھی۔ وہ جو میرے بن ایک پل نہیں رہ سکتی تھی۔ میری خواہش جاننے کے بعد خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ سبھی کو بتاتی پھرتی تھی کہ طہٰ عالم اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب یوں چند دنوں میں ہی ایسی کیا وجہ بن گئی تھی کہ وہ مجھ سے یوں متنفر ہورہی تھی۔

داؤد مجھے اور عبیرہ کو یوں ایک ساتھ اس جگہ صلح کروانے کی غرض سے لایا تھا لیکن اسے کیا پتہ تھا کہ یہاں آ کر ہمارے بیچ نازک سا بندھن ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگے گا۔ میں اسی رنج میں گھلتا کافی دیر سے اندر بیٹھا پی رہا تھا۔ جب داؤد میرے پاس آیا' وہ مجھے اب جلد یہاں سے واپس چلنے کا کہہ رہا تھا۔ سورج غروب ہورہا تھا اور اب ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرے میں پہنچ رہا ہوں۔ وہ میری بات سن کر چلا گیا

لیکن اس نے مجھ سے یہ تک دریافت نہیں کیا کہ آخر میں جو یہاں عبیرہ سے صلح کرنے آیا تھا اب یوں مجنوں بنا پی کیوں رہا ہوں۔ کاش! اس وقت میں نے اس بات پر ہی غور کرلیا ہوتا تو مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہوتا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا لیکن خود کو سنبھال نہیں پایا اور لڑکھڑاتے ہوئے گرتے گرتے بچا۔ کمرے میں بکھری میز اور کرسیوں کا سہارا لے کر میں ایک طرف موجود الماری کی جانب بڑھا' الماری کے پاس پہنچ کر میں نے ایک ناگوار سا ڈکار لیا اور جیب سے چابی نکال کر لگائی پھر الماری کا دروازہ کھلتے ہی اس میں بنے ایک چھوٹے دراز میں سے میں نے پھر چابی لگا کر ایک ریوالور نکالا' اس میں گولیاں چیک کیں اور پھر اسے اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ بسا اوقات فارم ہاؤس سے نکلنے میں مجھے دیر ہوجاتی تو میں یہاں اپنی حفاظت کے لیے رکھے ریوالور کو واپسی کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیا کرتا تھا۔ اب اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں جو باہر نکلا تو ٹھیک سے چل بھی نہیں پا رہا تھا۔ میں نے دور سے ہی دیکھا داؤد ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا اس کے مقابل سیٹ پر عبیرہ بیٹھی تھی۔ پچھلی جانب دو دوست بیٹھے تھے جن میں سے ایک مجھ پر نظر پڑتے ہی جیپ سے کود کر میری جانب بڑھا تو اس کا ایک بازو تھامے میں آگے بڑھا' میرے جیپ میں بیٹھتے ہی داؤد نے جیپ آگے بڑھا دی تھی۔ راستہ بھر سبھی آج فارم ہاؤس میں بتائے دن پر تبصرہ کرتے رہے داؤد کے قہقہے سب سے زیادہ بلند تھے اور میں نشے میں دھت ابھی تک اسی وجہ کو تلاش کرنے میں مگن تھا جو عبیرہ مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔

میں اکثر اس کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتا تھا وہ بھی مجھے میری طرح چپ چاپ کھوئی کھوئی سی بیٹھی دکھائی دی۔ اب جیپ چھوٹے چھوٹے قصبوں سے ہو کر گزر رہی تھی۔ ہم لوگ نصف سے زائد سفر طے کر چکے تھے۔ رات کے سوا دس ہو رہے تھے اور ان چھوٹے چھوٹے قصبوں کی سبھی دکانیں تقریباً بند ہو چکی تھیں۔

میں اب تک کئی سگریٹ پھونک چکا تھا۔ آخری سگریٹ کو پھینکتے ہوئے میں نے ایک اور سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور جو لائٹر کو جلانے لگا تو اب اس کا کمزور سا شعلہ سگریٹ کو سلگانے کے لیے نہ کافی ثابت ہوا۔ میں نے غصے سے لائٹر ایک جانب ہوا میں اچھال دیا لیکن کسی اور کے پاس بھی اس وقت کوئی ماچس یا لائٹر نہ تھا۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی اور پھر ایک جگہ روشنی دیکھ کر میں نے داؤد کے کاندھے پر ہاتھ رکھا' میں اس کی عقبی جانب اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا' اس نے جیپ دکان کے بالکل قریب سامنے لے جا کر کھڑی کر دی۔

میں جیپ کے رکتے ہی نیچے اترا ایک دوست مجھے سہارا دینے کے لیے اترنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ میں دکان کی جانب بڑھا دکانوں کی لمبی قطار میں فقط وہ پہلی دکان ہی کھلی پڑی تھی۔ دکان کے سامنے بنے برآمدے کی ملگجی روشنی میں جو میں آگے بڑھا تو مجھے دیکھ کر دکان میں موجود شخص اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سر پر سفید جالی دار ٹوپی چہرے پر سنت کے مطابق داڑھی' سفید لباس پہنے وہ چوبیس پچیس سالہ جوان شخص تھا' اور اس وقت اس کے ہاتھ میں قرآن تھا' جسے میرے سامنے ہی اس نے چوم کر آنکھوں سے لگا کر ایک جانب رکھا اور میری جانب متوجہ ہو کر دیکھنے لگا۔ میں کاؤنٹر کے

قریب پہنچا اور جیسے ہی میں نے بولنے کے لیے لب کھولے اس نے میرے منہ سے آتی شراب کی ناگوار بو کو محسوس کرتے ہوئے اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی اس حرکت کی پروا کیے بغیر میں نے اسے کہا کہ مجھے ماچس یا لائٹر چاہیے یہ سن کر اس نے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹایا اور یوں غصے اور حقارت سے ایک ہاتھ آگے بڑھا کر جیسے اس نے مجھے دھتکارتے ہوئے وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ اس کا وہ ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے ایسا کہنے کی دیر تھی کہ میں پھر اپنے آپے میں نہ رہا' میری دماغی حالت جو پہلے ہی ابتر تھی اس کی اس حرکت نے مجھے جیسے پاگل بنا کے رکھ دیا اور میں نے اگلے ہی پل جیب میں رکھے ریوالور کو نکالا اور اس پر گولی چلادی۔

گولی کے چلتے ہی وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھے کاؤنٹر کے دوسری جانب فرش پر جا گرا اور میرا ہاتھ جیسے ابھی تک وہیں ہوا میں ہی معلق تھا۔ جب عبیرہ کی چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی میں نے پلٹ کر دیکھا داؤد جیپ اسٹارٹ کر چکا تھا' میں تیزی سے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ جیپ کی جانب بڑھا۔ ابھی میں نے بامشکل چند قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ داؤد جیپ لے کر آگے بڑھ چکا تھا۔ میں نے انہیں آواز دینا چاہی لیکن آواز جیسے میرے حلق میں ہی دب کر رہ گئی تھی۔ میں جیپ کے پیچھے دوڑا وہ چند لمحوں میں ہی مجھ سے بہت آگے دور نکل چکے تھے۔ میں کچھ آگے جا کر وہیں ٹھہر گیا اور ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی گولی کی آواز سننے کے باوجود ابھی تک وہاں کوئی نہیں پہنچا تھا۔ چارسو پھیلی چاند کی چاندنی میں' میں نے سر گھما کر دکان کی جانب دیکھا وہاں کاؤنٹر کے دوسری جانب فرش پر ڈھیر وہ اجنبی جوان پڑا تڑپ رہا ہوگا یا مر چکا ہوگا' ایسا میں نے فقط سوچا' وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ گھٹنوں پر ہاتھ ٹکائے آگے بڑھتی شاہراہ کی جانب سر کو اٹھائے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں انہیں آوازیں دے رہا تھا۔

''داؤد......عبیرہ......واپس آجاؤ......'' وہ جو مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انہیں واپس کب آنا تھا اور میں تاحال اسی دکان سے چند گز کے فاصلے پر ہی کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اس دکان تک پہنچتا مجھے اب یہاں سے بھاگنا تھا۔ پہلے جس نشے نے میرے حواس سلب کر رکھے تھے' میرے ہاتھ سے یوں گولی کے چل جانے اور داؤد اور عبیرہ کے مجھے بے یارومددگار چھوڑ کر بھاگ جانے کے بعد گویا میرے چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔ میرا نشہ ٹوٹ چکا تھا۔ میں اٹھ کر وہاں سے سرپٹ بھاگنے لگا لیکن مجھے جانا کہاں تھا یہ سوچ کر کچھ آگے جا کر میں پھر سے ٹھہر گیا تھا۔ اب دکان کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ ایسے قصبے سرشام ہی ویران ہو جاتے تھے۔ یہاں سے کسی قسم کی کوئی سواری نہیں مل سکتی تھی اور شہر یہاں سے میلوں دور تھا۔ گھر جانا بھی مناسب نہ تھا۔ یہ کون سی جگہ تھی میں نے یہ سوچ کر اردگرد نگاہ دوڑائی پاس ہی ایک دیوار پر کسی اشتہار کے ساتھ وسن پورہ لکھا تھا۔ وسن پورہ میرے ذہن میں ایک دم سے جھماکا سا ہوا۔ مائیکل ہمارا ڈرائیور بھی تو اسی قصبے وسن پورہ کا رہائشی تھا۔ میں کئی بار اسے یہاں اس کے گھر سے لینے آیا تھا۔ یعنی آج رات میں مائیکل کے گھر گزار سکتا ہوں ایسا سوچتے ہی میں دائیں بائیں مڑ کر اس جگہ کی شناخت کرنے لگا۔ مائیکل کے گھر اس کی گلی میں داخل ہونے سے پہلے بجلی کا ایک بڑا کھمبا آتا تھا' یہ یاد آتے ہی میں بجلی کے تاروں کے ساتھ ساتھ

چلنے لگا۔ دور الیون کے دی کے بڑے سے کھمبے کے ساتھ ایک برقی قمقمہ روشن دکھائی دے رہا تھا۔ میں تھوڑی ہی دیر میں اس برقی قمقمے کے عین نیچے جا پہنچا تھا۔ میں نے اک نظر سر اٹھا کر دیکھا اس پر ایک عبارت کندہ تھی۔ "خورشید عالم ایم این اے"، یعنی میں ابا کے حلقہ کی حدود میں ہی تھا۔ میں نے سامنے نگاہ اٹھا کر دیکھا سامنے وہی گلی دکھائی دے رہی تھی جس میں مائیکل کا گھر تھا۔ گلی میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک بار گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا' چارسو ویرانی سی ویرانی چھائی تھی۔ کوئی بندہ بشر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فقط چند گز کے فاصلے پر کنٹونمنٹ بورڈ کے رکھے بڑے کچرادان کے پاس چند کتے بھونک رہے تھے۔ میں آہستہ سے چلتا ہوا تنگ و تاریک سی گلی میں اتر گیا۔

لیکن اندر گلی میں موجود گھروں میں سے مائیکل کا گھر کونسا تھا؟ اب اس بات نے مجھے شش و پنج میں مبتلا کر رکھا تھا۔ میں فقط دو ایک بار ہی اسے چھوڑنے یا لینے آیا تھا اور ایک بار اس کے ضد کرنے پر میں اس کے گھر چائے پینے آیا تھا۔ اس وقت دن تھا اور اب رات' اور میں کسی کا قتل کر کے پناہ ڈھونڈنے آیا تھا۔ گھبراہٹ میں' میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا' دو چار گھر چھوڑ کر ایک گھر کے دروازے کے سامنے میں رک گیا۔ گھر کھوجنے میں مجھے جس قدر دشواری پیش آ رہی تھی' اب اس سے کئی گنا کٹھن مجھے دروازے پر دستک دینا محسوس ہو رہا تھا۔ میں دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھاتا اور ہاتھ مجھے یوں منوں بھاری ہوتا محسوس ہوتا اور پھر دروازے پر دستک دیئے بغیر ہی میں ہاتھ نیچے لے جاتا' اسی کشمکش میں کچھ وقت مزید گزر گیا۔ پھر ہمت جتا کر میں نے دستک دے ہی دی اور میری سوچ کے برعکس میری پہلی ہی دستک پر مجھے اندر سے کئی قسم کی ملی جلی آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ میں نے دوسری بار دستک نہ دی' میں وہیں کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ مائیکل ابھی آ کر دروازہ کھولے گا' جب دروازے کی کنڈی کھلتے ہوئے مجھے اندر سے آواز سنائی دی۔ "ذرا رکنا اجمل پتر...... کئی بار کہا ہے اسے گریس دے دو' کتنا دشوار ہو گیا ہے اسے کھولنا۔" کنڈی کے کھلتے ہی سامنے کھڑے بزرگ شخص نے جیسے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میں نے غلط گھر کے دروازے پر دستک دے دی تھی۔ میں جیسے اپنی غلطی سدھارنے کے لیے جھٹ سے بولا۔ "بابا جی کیا یہ مائیکل کا گھر ہے؟"

"نہیں بیٹا' مائیکل کے گھر کا دروازہ تو یہ ساتھ والا ہے۔" بابا جی نے گھر کی دہلیز سے چند قدم آگے آتے ہوئے کہا۔

"معذرت بیٹا' میں سمجھا میرا بیٹا اجمل آیا ہے۔" میں آگے بڑھ چکا تھا جب میرے عقب سے بابا جی کی آواز مجھے سنائی دی۔ معذرت تو مجھے کرنا چاہیے تھی جو یوں رات کے اس پہر دروازے پر دستک دے کر انہیں تکلیف دی' لیکن میں اس وقت جیسی کشمکش میں مبتلا تھا میں ان باتوں کا بھلا کیا لحاظ کرتا اب میں مائیکل کے گھر کے دروازے سے باہر کھڑا تھا' میں نے جھٹ سے دروازے پر دستک دی اور پھر دوسری تیسری چوتھی دستک کے بعد جو مائیکل نے دروازہ کھولا تو میں دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہو گیا۔ عین اسی لمحے جب میں فوراً اندر داخل ہوا تھا وہ مجھے پہچان نہیں پایا اور گھبرا کر وہ میری طرف مڑا۔ دروازہ ابھی کھلا ہی تھا' یہ دیکھ کر میں نے پلٹ کر دروازہ خود ہی بند کر کے اسے کنڈی لگا دی۔

"چھوٹے صاحب آپ؟ اس وقت؟ اتنی رات کو؟" وہ مجھے پہچان گیا تھا اور اب حیران ہو کر اس

نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اسی دوران اندر سے اس کی بیوی کی آواز آئی۔

''کون ہے مائیکل؟'' رات کے اس پہر دروازے پر ہونے والی دستک سن کر مائیکل کے بیوی بچے بھی جاگ گئے تھے۔ میں نے ایک نظر اندرونی دروازے کو دیکھ کر مائیکل کو کاندھوں سے پکڑ ے اسے اپنے سے ذرا قریب کر لیا تھا۔

''مائیکل مجھ سے خون ہو گیا ہے۔''

''کیا بولا صاحب۔'' مائیکل کو جیسے میری بات پر یقین ہی نہیں آیا۔ وہ میری بات سن کر اب کچھ خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ''صاحب کیسے ہوا یہ سب؟'' اس سے پہلے کہ میں اسے مزید کچھ کہتا وہ کانپتا ہوا ارد گرد دیکھنے لگا اور بولا چلو صاحب اوپر چلو۔'' وہ مجھے ایک طرف لگی تنگ سی سیڑھی کی طرف لے گیا۔ سیڑھی اوپر ایک کھلی چھت سے جڑی تھی اور اس سے آگے ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ مائیکل مجھے بنا رکے اس کمرے میں لے گیا' اندر پہنچتے ہی اس نے کمرے کی لائٹ آن کی اندر ایک بیڈ پڑا تھا۔ مائیکل کے کہنے سے بھی پہلے میں بیڈ دیکھ کر یوں اس پر جا ڈھیر ہوا گویا میلوں کی مسافت سے ابھی لوٹا تھا۔ پھر مائیکل بھی جیسے میری ذہنی حالت کو سمجھ چکا تھا۔ میرے لیٹتے ہی وہ میری ٹانگیں دابنے لگا' لیکن مجھے اس کے ایسا کرنے سے راحت کہاں ملنے والی تھی۔ میں نے اسے منع کر دیا۔ وہ جھٹ سے اٹھا۔

''صاحب آپ کو بھوک لگی ہوگی میں ابھی کھانا تیار کرواتا ہوں۔ صاحب اب آپ ادھر محفوظ ہیں۔ مائیکل ہے ناں آپ کو کسی قسم کی فکر نہیں کرنا۔'' وہ مجھے تسلی دے کر چلا گیا لیکن مجھے اس کے کہے چند بول بھی میری دلجوئی کے لیے بہت بڑے محسوس ہوئے۔ ہاں میں بہت برا تھا' ہر طرح ہر قسم کے گناہوں کا عادی تھا لیکن میں نے آج سے پہلے کسی انسان کا قتل نہیں کیا تھا۔ کسی کی جان نہیں لی تھی اور اب میں ایک بے گناہ معصوم انسان کو یوں موت کے گھاٹ اتار کر یہاں سکون سے بیٹھا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھا۔ داؤد نے جو میرے ساتھ کیا تھا وہ بھی میرے لیے کس قدر اذیت ناک تھا۔ میرے ہاتھ سے گولی چل جانے کے بعد بجائے اس کے وہ مجھے خود وہاں سے گاڑی میں اپنے ساتھ کسی محفوظ جگہ لے جاتے داؤد نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مجھے وہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ عبیرہ بھی تو اس کے ساتھ ہی موجود تھی۔ گولی چلتے ہی عبیرہ کے منہ سے نکلنے والی چیخ میں نے سنی تھی۔ شاید وہ میرے یوں اچانک گولی چلانے پر اور سامنے موجود آدمی کے سینے سے پھوٹتے خون کے فوارے کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی تھی۔ داؤد کے گاڑی آگے بڑھاتے ہی میں ان کے تعاقب میں دوڑا بھی تھا کہ ہو سکتا ہے داؤد آگے جا کر گاڑی روک دے یا عبیرہ' داؤد کو واپس چلنے کو کہے اسے کہے کہ ہمیں طٰہٰ کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے اس کی مدد کو چلنا چاہیے لیکن ایسا نہیں تھا' اگر ایسا ہوتا تو میں وہاں کافی دیر تک کھڑا رہا تھا' جس سمت وہ جیپ لے کر گئے تھے اسی راستے پر چل کے میں مائیکل کے گھر تک آیا تھا لیکن داؤد جیپ لے کر واپس نہیں آیا تھا لیکن میرا دل یہ بات بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ عبیرہ بھی داؤد کے ساتھ مل چکی ہوگی۔ ایسے ہی کئی طرح کے خیالات میرے ذہن میں ابھر رہے تھے جب مائیکل اندر داخل ہوا اس نے پانی کا گلاس میری جانب بڑھایا میں نے چند گھونٹ پی کر اسے ایک طرف رکھ دیا اور وہ یہ کہہ کر کہ وہ کھانا لے کر آتا ہے پھر سے واپس چلا گیا۔

مائیکل کے جانے کے بعد اور پانی پی لینے کے باوجود مجھے کمرے میں گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ بے چینی اور گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے میں کمرے سے نکلا کمرے کے سامنے کا کھلا حصہ اس گھر کی چھت تھا اور کمرے کے سامنے جیسے چھوٹا سا صحن نما حصہ تھا۔ جس میں ایک جانب چند گملے پڑے تھے۔ کمرے کی مخالف سمت سامنے اونچی جالی دار سیمنٹ کی دیوار تھی۔ شاید اس دیوار کو بھی چھت ڈالنے کے لیے اوپر تک تعمیر کر دیا گیا تھا اور اس دیوار کے عین نصف حصے میں سیمنٹ کی بنی جالی ہوا کی آمد ورفت کے لیے لگا دی گئی تھی۔

جالی دار دیوار میں سے چاند کی چاندنی کا عکس چھت پر بھی ایک جالی کی دیوار بنا رہا تھا۔ میں آگے بڑھا اور جالی دار دیوار کے پاس ہی نیچے بیٹھا سوچنے لگا کہ وہاں اس دکان پر کوئی شخص آیا ہوگا' اسے کوئی چیز خریدنا ہوگی لیکن جب اس نے خون سے لت پت لاش پڑی دیکھی ہوگی تو فوراً پولیس کو اطلاع کر دی ہوگی یا ہوسکتا ہے وہ اس دکان والے شخص کو پہچانتا ہو اور فوراً وہ ان کے گھر تک پہنچا ہو' اور پھر اس گھر کے مقیم لوگوں کو وہ منحوس خبر سنائی ہو کہ ان کا بیٹا اب نہیں رہا اور جب نئے دن کا سورج طلوع ہوگا تو سبھی نیوز چینل پر یہ پٹی چل رہی ہوگی کہ ایک سیاسی رہنما کے بیٹے نے ایک جواں سالہ شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا' یوں ابا کا سیاسی کیریئر میری وجہ سے داغ دار ہوجائے گا اور پھر صرف پولیس ہی نہیں بلکہ میرے ابا بھی میری تلاش شروع کر دیں گے۔ وہ جو اپنے ہر عیب اور جرم پر یوں پردہ ڈال لیتے تھے کہ دنیا کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی' وہ میرے سرعام قتل پر مجھے کبھی معاف کرنے والے نہ تھے۔

لیکن مجھے تو وہاں گولی چلاتے کسی نے نہیں دیکھا تھا اور یہ طے تھا کہ داؤد' عبیرہ یا میرے دوستوں میں سے کوئی بھی اس حادثے کے بارے میں کہیں کچھ بتانے والا نہ تھا پھر پولیس کو مجھ تک پہنچنے کے لیے کوئی ثبوت بھی تو درکار ہوگا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں اگلے ہی پل ایک دم سے اچھل پڑا اور کھڑے ہو کر اپنی پینٹ کی ساری جیبیں کھنگالنے لگا لیکن ریوالور جہاں گرا تھا' میں اسے وہاں سے اٹھانا بھول گیا تھا اور اب بے بسی اور حیرت کی تصویر بنا میں پھر سے پاؤں پسار کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اپنے جسم کو جیسے بے جان سا ڈھیلا چھوڑ دیا جب عین اسی وقت میرے کانوں سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی۔

''امی! آج اجمل بھائی کہاں رہ گئے' اتنی دیر تو انہیں کبھی نہیں ہوئی۔'' یہ بات سن کر میں نے بیٹھے بیٹھے سر کو گھما کر دیکھا' سیمنٹ کی جالی دار دیوار سے بالکل نیچے ساتھ والے گھر کا آنگن چاند کی مدھم روشنی میں دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے مائیکل کے گھر آنے سے پہلے غلطی سے اسی گھر کے دروازے پر دستک دی تھی اور اس وقت بھی ایک کمزور بوڑھے بابا جی مجھے اجمل سمجھ رہے تھے پھر میری نظریں ابھی اس صحن سے ہٹی ہی تھیں کہ مجھے زور زور سے اسی جانب دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ کوئی زور زور سے ان کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے اسی جانب پھر دیکھتے ہوئے سوچا کہ لگتا ہے' اب اجمل ہی ہوگا جس کا اس گھر بھر کو انتظار ہے۔ میں نے دیکھا وہی کمزور سا بوڑھا شخص دروازے کی جانب بڑھا پھر کوئی لڑکی پیچھے سے دوڑی آئی۔

''ابا آپ دروازہ کھولنے میں بہت دیر کر دیتے ہیں' بھیا ہوگا میں کھولتی ہوں۔'' لڑکی کی بات سن کر بوڑھا شخص وہیں صحن کے وسط میں رک گیا۔ لڑکی دروازے کی جانب بڑھی' وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

''ایک تو اتنی دیر کردی آنے میں اوپر سے ذرا صبر نہیں ہو رہا' اچھا بھئی صبر کھولتی ہوں۔'' لڑکی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اپنے سر پر آنچل سنبھالتی پیچھے ہٹ گئی۔

''کوئی سیانا گھر پر ہو تو بیٹی اسے بلاؤ۔'' کوئی ادھیڑ عمر آدمی تھا' صحن میں کھڑے بوڑھے شخص نے باہر کھڑے شخص کی آواز سن لی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا آگے بڑھا' باہر کھڑا شخص انہیں آگے بڑھتا دیکھ کر چند قدم آگے چلا آیا۔

''چاچا آپ ہی اجمل کے ابا ہیں...... چاچا...... حوصلہ رکھنا بڑی بری خبر ہے۔ چاچا تیرا اجمل...... وہ جیسے کہتے کہتے رک گیا۔ فاصلہ کچھ اتنا کم تھا کہ ان کے درمیان ہو رہی ساری باتیں مجھے واضح سنائی دے رہی تھیں۔ چاچا حوصلہ رکھنا بڑی بری خبر ہے' باہر کھڑے شخص کے یہ الفاظ سن کر جیسے میرے نیچے اوپر کا سانس وہی رک گیا تھا۔ پھر باہر کھڑے شخص نے اپنی بات مکمل کی۔ ''چاچا تیرا اجمل قتل ہوگیا ہے۔'' پاس کھڑی لڑکی نے یہ بات سنتے ہی اس زور کی چیخ لگائی کہ میرا دل دہل گیا۔

''اجمل پتر......'' اجمل کے ابا جو یہ خبر سن کر اک لمحے کو ساکت کھڑے رہ گئے تھے انہوں نے دلخراش آواز سے اپنے اجمل کو پکارا' ایک لمحے کے کچھ حصے میں اسی آنگن میں جہاں جیتے جاگتے اجمل کا انتظار ہو رہا تھا۔ کہرام مچ گیا۔ اندرونی کمروں سے چند اور خواتین صحن میں آگئیں۔

''اماں......''

''کیا ہوا میرے اجمل پتر کو......؟''

''اماں بھائی......'' کسی پر غشی کا دورہ پڑا' صحن کے وسط میں ماں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ بوڑھا باپ اور ایک لڑکی اس شخص کے ساتھ باہر کو دوڑے' گلی میں جہاں سے وہ گزر کر جا رہے تھے ان کے رونے اور چیخنے کی آوازیں دور سے بھی آتی سنائی دے رہی تھیں پھر مجھے کسی کے تیز تیز قدموں سے سیڑھی چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ میں جھٹ سے ذرا ایک طرف دیوار کے ساتھ چمٹ گیا۔

''مائیکل چاچا...... جلدی آئیں' مائیکل چاچا...... اجمل بھائی'' ایک لڑکی ساتھ والے صحن سے سیڑھیاں چڑھ کر جالیوں والی دیوار سے لگی زور زور سے مائیکل کو پکار رہی تھی۔ شاید مائیکل نے گلی میں رونے چیخنے کی آواز سن لی تھی اسی لیے وہ چھت پر نہیں آیا وہ دروازہ کھول کر اجمل کے ابا کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ وہ لڑکی چند ایک لمحے ہی وہاں کھڑی روتی مائیکل کو پکارتی رہی اور پھر مائیکل کے نہ آنے پر وہ الٹے پیروں نیچے کو دوڑی۔

''اماں......' اماں ہوش کر......''

''میرا پتر اجمل نہیں' ایسا نہیں ہوسکتا' میرا اجمل نہیں۔''

''اماں...... بھائی...... میرے بھائی کو کچھ نہیں ہوا...... اماں...... اماں اجمل کو کچھ نہیں ہوا ابا بھائی کو لینے گئے ہیں' دیکھنا...... اماں وہ ابھی بھائی کو لے کر آجائیں گے۔''

یارب یہ اجمل کا ہی گھر تھا۔ میں سر تھامے قدرے جھک گیا۔ رات کی تاریکی میں گونجنے والی دردناک آوازیں میری قوت برداشت سے باہر تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اجمل کے گھر کا چھوٹا سا آنگن لوگوں سے بھر گیا۔ اب تو گھر والوں کے ساتھ ساتھ محلے دار عورتوں کے رونے کی بلند آوازیں بھی آ شامل ہوئی تھیں۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

